

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ریوالن غالب



دیوانِ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب

اِقراء عکس شمیم

رسول پلازہ کوٹوالی روڈ فیصل آباد فون: 326250



فضل سنٹر (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، کراچی

Deewan-e-Ghalib
by
Mirza Asadullah Khan Ghalib

© فضل ستر ۲۷ دسمبر ۱۹۹۷ء

پیشکش و اہتمام
طارق رحمن فضل

ناشر و ملاح
فضل ستر (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اردو بازار - کراچی

خوشنویس
خلیق ٹوکی مرحوم

تقسیم کار
فضل بک سپر مارکیٹ

۳ لما پارسی بلڈنگ اردو بازار کراچی

Phones: 2629720-5 Fax: 9221-2633887

Email: fazlee@cyber.net.pk

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیوان غالب کا زیر نظر ایڈیشن مرزا غالب کے دو سو سالہ
جشن ولادت کے موقع پر فضلی سنز، کراچی، کی جانب سے پیش
خدمت ہے۔

مرزا کی زندگی میں دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن شائع
ہوئے۔ طبع چہارم، جو غالب کے اپنے مصدقہ متن پر مبنی ہے،
مطبع نظامی، کانپور، سے جون ۱۸۶۳ء میں اشاعت پذیر ہوا، جس
میں گزشتہ چار ایڈیشنوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ یعنی
کل اٹھارہ سو دو (۱۸۰۲) اشعار ہیں۔ استفادہ کا دائرہ وسیع کرنے
کے لئے نسخہ حمید یہ کا انتخاب (۳۰۳ کل اشعار) بھی شامل کر لیا
گیا ہے اس طرح اس مجموعہ میں اشعار کی کل تعداد ۲۱۰۵ ہے۔

فضلی سنز نے ایک طویل عرصے پر محیط پاکست سائز دیوان
غالب کی عدم اشاعت کے علاوہ صرف پڑ کرنے کی کوشش کی
ہے بلکہ اسے ارزاں قیمت پر فراہم بھی کیا ہے تاکہ سخن فہم اور
سخن شناس قارئین کے ساتھ طلباء اور طالبات بھی اس سے
استفادہ کر سکیں۔

اس یادگار ایڈیشن کے علاوہ فضلی سنز کراچی نے غالب
کے دو صد سالہ جشنِ یوم ولادت پر ایک پوسٹر بھی شائع کیا
ہے۔ اس دیوانِ غالب کے سرورق اور پوسٹر کی یہ تصویر غالب
کی مستند ترین تصویر کے مطابق بنوائی گئی ہے۔

ہمیں امید ہے پرستارِ انِ غالب اس خوبصورت تحفہ کو
پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اسے وہ پذیرائی حاصل ہو
گی جو خود کلامِ غالب کو حاصل ہے کہ

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

طارق رحمن فضلی

۲۷ دسمبر ۱۹۹۷ء

عَلَم

غالب از خاک پاک تو را شیم
 ترکِ ناولیم و در ترا دهش
 آیه یکم از جماعتِ اتراک
 فنِ آبای ما کشاورزیست
 و در مهنی سخن گزاران
 فیض حق را کمیند شگرویم
 هم بتایش به برق هم تقسیم
 به تلاشیکه هست فیروزیم
 لاجرم در نسبِ فره مندیم
 به شترگانِ قومِ پویندیم
 در تمامی زمانه و چندی
 مرزبانِ زاده سمرقندیم
 خود چه گوئیم آنچه و چندی
 عقل کل را بهیشتنِ فزینیم
 هم به بخشش برابرماندیم
 به معاشیکه نیت خردنیم

همه بر خویش تن همی گریم
 همه بر روزگاری خشنیم

ہستی کے قیمت فریب میں آجا ہوا سہ
عالم تمام حلقہ مسترداںم خیال ہے

آتے ہیں غیب کی مضامین خیال میں



غالب سرسبز عامہ نوائے سہروردی ہے

جو یہ کہے کہ: ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی؟
گفتہ: غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ: یوں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱

نقش، فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
کاؤ کا وسخت جانی اسے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے بشیر کا
جذبہ بے اختیار شوق دکھیا چاہیے
سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دایم شنیدن جس قدر چاہئے بچائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا
بس کہ ہوں غالب! اسیری میں بھی آتش زیر پا
مٹوے آتش دیدہ، ہے حلقہ مری زنجیر کا

تیٹے بغیر، مر نہ سکا کوہکن، اسد !
سرگشتہ، تھمارِ رسوم و قیود تھا



کہتے ہو، نہ دینگے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیت کامڑا پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا
دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
سادگی و پُرکاری، بخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں، جرأت آزما پایا
غمنہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
 ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا
 شورِ پسندِ ناصح نے زخم پر نہک چھڑکا
 آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا؟



دل مرا سوزِ نہاں سے بے غما باجل گیا
 آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
 دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
 آگِ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
 میں عدم سے بھی پرے ہوں، در نہ غافل! بارہا
 میری آہِ آتشیں سے بالِ عنفت جل گیا
 عرض کیجے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں
 کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرِ اجل گیا

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
 اس چراغاں کا، کروں کیا، کار فرما جل گیا
 میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب ! کہ دل
 دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہل دنیا جل گیا



شوق، ہر رنگِ رقیبِ سردساں نکلا
 قیسِ تصویر کے پردے میں بھی غریباں نکلا
 زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب !
 تیر بھی سینہٴ بوسل سے پر افشاں نکلا
 بوئے گل، نالہٴ دل، دودھ چراغِ مخلص
 جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
 دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
 کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا

تھی نوآمو زِ فنا، ہمتِ دُشوار پسند
 سخت مشکل ہے کُئیہ کام بھی آساں نکلا
 دل میں پھر گریے نے اک شورا اٹھایا غالب !
 آہ ! جو قطرہ نہ نکلا تھا ، سو طُوفان نکلا



دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
 عشقِ نبردِ پیشہ طلبگارِ مرد تھا
 تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
 اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگِ زرد تھا
 تالیفِ نسخہ ہاے وفا کر رہا تھا میں
 مجموعہ خیال ابھی فردِ فرد تھا
 دل تاجگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
 اس رگِ زریں جلوہ گُل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی نگش کش اندوہِ عشق کی
 دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
 احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر کے
 زنداں میں بھی خیالِ بیا بیاں نہ دتھا
 یہ لاشیں بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
 حقِ مغفرت کرے! عجب آزادِ مرد تھا



شمارِ سچہ مرغوبِ بہتِ مشکلِ پسند آیا
 تماشاے بیک کفِ بُردنِ حد دلِ پسند آیا
 بفیضِ بیدیِ نو میدیِ جاوید آساں ہے
 کشائش کو ہمارا عقدہ مشکلِ پسند آیا
 ہواے سیرِ گلِ آیینہٴ بیہریِ قاتل
 کہ اندازِ بخونِ غلتیدنِ بسلِ پسند آیا



دہریں، نقشِ وفا دجہ تسلی نہ ہوا
 ہے یہ وہ لفظ کہ شہرِ مندہ معنی نہ ہوا
 ہنرِ خط سے ترا کا کل سرکش نہ دبا
 یہ زمرِ دہلی، حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
 میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
 وہ ستگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
 دل گزر گاؤں خیالِ مے و ساغر ہی سہی
 گر نفسِ جادہ سرِ سنزلِ تقویٰ نہ ہوا
 ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ بھی
 گوشِ منت کش گھلبانگِ تسلی نہ ہوا
 کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
 ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں، سودہ بھی نہ ہوا
 مر گیا صدرِ یک جنبشِ لب سے غالب
 نا توانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا



ستایشگر ہے زاہد، اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک نگہ تہ ہے ہم بخودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیداد کا و شہیاسے مژگاں کا
کہ ہر یک قطرہٴ خونِ دانہ ہے سبجِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع، میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو ترنکا، ہوا ریشہ نیتاں کا
دکھا ڈمکا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سرورِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پر تو خرمشید عالمِ شبنمِ نساں کا
مری تعمیر میں، مضمر ہے اک صورتِ خرابی کی
ہیوولی برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دھماں کا
اُگائے گھریں ہر سو سبزہ، دیرانی تماشا کر
مدا زاب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
 چراغِ مُردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا
 ہنوز اک پر تو نقشِ خیالِ یار باقی ہے
 دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
 بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
 سبب کیا، خواب میں آکر بستم ہاے پہنہاں کا
 نہیں معلوم، کس کس کا ہو پانی ہوا ہوگا
 قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مڑگاں کا
 نظریں ہے ہماری جسادۂ راہِ فنا، غالب!
 کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا



نہ ہوگا، یک بیاباں ماندگی سے، ذوق کم میرا
 حجابِ موجہ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
 محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بیدار غمی ہے
 کہ موجِ بُوے گل سے، ناک میں آتا ہے دم میرا



سراپا رہن عشق و ناگزیرِ اَلَفْتِ ہستی
عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور افسوسِ حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریا سے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا



محرم نہیں ہے تو ہی 'نوا' ہے راز کا
یاں در نہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سوے غیرِ نظرِ اے تیز تیز!
میں اور دکھ تری مژدہ ہے دراز کا!
صرف ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
ٹکے ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بیکہ، جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
 ہر گوشہ و بساط ہے سرِ شیشہ باز کا
 کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
 ناخن پہ قرصِ اُس گروہِ نیم باز کا
 تاراجِ کاوشِ غمِ حُجراں ہوا اسد!
 سینہ، کہ تھا دُفینہ، گہراے راز کا



بزمِ شاہنشاہ میں، اشعار کا دفتر کھلا
 رکھیو، یارب! یہ درِ گنجینہ گو ہر کھلا
 شب ہوئی، پھر انجمِ خوشندہ کا منظر کھلا
 اِس تکلف سے کہ گویا بُتکدے کا در کھلا
 گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
 آستیں میں دشنہ نہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا
 گونہ بھجوں اُس کی باتیں، گونہ پاؤں اُس کا بھید
 پر یہ کیا کم ہے کہ، مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
 خُلد کا اک دَر ہے میری گور کے اندر کھلا
 مُنٹھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
 زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے مُنٹھ پر کھلا
 در پہ رہنے کو کہا اور کہ کے کیسا پھر گیا
 جتنے عرصے میں برا لپٹا ہوا بستر کھلا
 کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول
 آج اُدھر ہی کو رہیگا دیدہ اختہ کُھنڈ؟
 کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو جو ادشاکِ جال
 نامہ لانا ہے وطن سے، نامہ برا کشر کھلا
 اُس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
 واسطے جس شہ کے، غالب! گنبد بے در کھلا





شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ابراب تھا
شعلہٴ جوالہ، ہر یکِ حلتہ گرداب تھا
واں کرم کو، عذیرِ بارش تھا عنائِ کیرِ خرام
گریے سے یاں، پنڈِ بالِش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پر ونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہِ نایاب تھا
جلوہٴ گل نے کیا تھا واں چسپاںِ آبِ بجز
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سر پر شورِ بے خوابی سے تھا دیوارِ جو
واں وہ فرقِ ناز، محوِ بالشِ کجواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشنِ شمعِ بزمِ بخودی
جلوہٴ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تاعرشِ دہاں طوفاں تھا سب رنگ کا
یاں نہیں سے آساں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کر ذوق کا وکسشِ ناخن سے لذتِ یاب تھا



نالہ دل میں شب اندازِ اثرِ نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بیتاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاطِ آہنگ ہے !
خانہء عاشقِ مگر سازِ صدائے آب تھا
نازِ ششِ ایامِ خاکِ تر نشینی، کہا کہوں
پہلو بے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے تجھ کو نارِ سانسے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمِ تاب تھا

ق

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟
 کل تک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
 یاد کرو وہ دن کہ ہر ایک حلقہ تیرے دام کا
 انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا
 میں نے رو کا رات غالب کو، وگرنہ دیکھتے
 اُس کے سیلِ گریرہ میں، گردوں کفِ سیلاب تھا



ایک ایک قطرے کا مجھے دنیا پڑا حساب
 خونِ جگر، و دیعتِ مرگ انِ یار تھا
 اب میں ہوں، اور ماتم یک شہرِ آرزو
 توڑا جو تو نے آسینہ، تماشِ دار تھا
 گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھر وکر میں
 جاں دادۂ ہوائے سہرِ رگزار تھا
 موجِ سراپِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
 ہر ذرۂ مثلِ جوہرِ تیغِ آبدار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر آب
دیکھ، تو کم ہوئے پہ عینِ روزگار تھا



بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشلنے کی
دردِ دیوار سے چپکے ہے بیاباں ہونا
واسے دیوانگی شوق، کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضاے نگہ کرتا ہے
جو ہر آمینہ بھی چاہے ہے مڑگاں ہونا
عشرتِ قلندر اہلِ سمٹا مت پوچھ
عیدِ نطرا رہے شمشیر کاغریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگِ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل ، زخمِ تمنا کھانا
 لذتِ ریشِ جگر، عشقِ نکداں ہونا
 کی مرے قتل کے بعد اُس نے جلسے توہ
 ہائے اس زرد پوشیاں کا پشماں ہونا !
 حیف ، اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب !
 جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا



شبِ نِمارِ شوقِ ساقی رُستخیز اندازہ تھا
 تا محیطِ بادہ ، صورتِ حسناء خمیازہ تھا
 یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
 جاہد ، اجزائے دو عالم وحشت کا شیرازہ تھا
 مانعِ وحشتِ خرامی ہائے یلی کون ہے
 خانہٴ بھونِ صحرَا گرد بے دروازہ تھا
 پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
 دستِ مرہونِ جُنا، رخسارِ رہنِ غازہ تھا

نالہ دل نے دیے اور اقی تختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ، یک دیوانِ بے شیرازہ تھا



دوست غمخواری میں میری سہمی فرماوینگے کیا
زخم کے بھرتے ملکِ ناخن نہ بڑھ جاوینگے کیا
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور اک تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماوینگے کیا؟
حضرتِ ناصح گرا دیں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ بھلاوینگے کیا
آج واں تیغ و کفن باز ہے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاوینگے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا، یوں سہی
یہ مجنونِ عشق کے انداز چھٹ جاوینگے کیا؟
خانہ زادِ زلفیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتِ بد وفا، زنداں سے گھبراوینگے کیا!

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ عسیم اُلفتِ اسد!
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھّا اونگے کیا؟



یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پہ جیسے ہم تو یہ جان چھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اُمت بار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نکیش کو
یہ خلیش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بے ہیں دوستِ ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ ، پھر نہ تھمتا
 جسے غم بجھ رہے ہو ، یہ اگر شرار ہوتا
 غم اگر چہ جاں گسل ہے ، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
 غمِ عشق گر نہ ہوتا ، عسبِ روزگار ہوتا
 کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بٹا ہے
 مجھے کیا بُرا تھا مرنا ، اگر ایک بار ہوتا
 ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
 نہ کبھی جنازہ اٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا
 اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
 جو دونی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
 یہ مسائلِ تصوف ! یہ ترا بیانِ غالب !
 تجھے ہم دل سمجھتے ، جو نہ بادہ خوار ہوتا





ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا ! نہ ہو مرناتو جینے کا مزہ کیا !
 تجاہل پیشگی سے مدعا کیا ؛ کہاں تک لے سراپا ناز کیا ، کیا
 نوازش ہاے بیجا دیکھتا ہوں شکایت ہاے رنگیں کا گھلا کیا !
 نگاہ بے محابا چاہتا ہوں تغافل ہاے تمکیں آزما کیا
 فروغ شعلہ خس ، یک نفس ہے ہوس کو پاس ناموس وفا کیا !
 نفس موج محیط بخودی ہے تغافل ہاے ساقی کا گھلا کیا
 دماغ عطر پیرا ہن نہیں ہے غم آوارگی ہاے صبا کیا
 دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
 محبا کیا ہے میں خاصن اِدھر فکے شہیدانِ نگہ کاخوں بہا کیا !
 سن اے غارِ گرجنس وفا ! سن شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
 کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ ؟ شکیبِ خاطر عاشق بھلا کیا
 یہ ، قاتل ، وعدہ صبر آزما کیوں ؟ یہ ، کافر ، فتنہ طاقت ربا کیا !

بلاے جاں ہے غالب اُس کی ہر بات

عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا



در خورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سانس نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں ہیں کہ ہم
اُٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وہ نہ ہوا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یمانی کا
رُو برو کوئی بستِ آیینہ سیما نہ ہوا
کم نہیں نازشِ ہمنامی چشمِ خواں
تیرا بیمار، بُرا کیسا ہے، گر اچھا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے، وہ نالہ کر لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے، جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر نبیٰ موسے دم ذکر نہ چپکے خونا ب
 حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا
 قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل!
 کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بیسنا نہ ہوا
 تھی جس گرم کر غالب کے اڑینگے پرزے
 دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشاً نہ ہوا



اسد! ہم وہ جنوں جولاں گداے بے سرو پا ہیں
 کہ ہے سر پنچہ مرگاہن آہو، پشت خار اپنا



پے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
 بخونِ غلیتیدہ صد رنگِ دعویٰ پارسائی کا
 نہ ہو حسنِ تماشا دوستِ رسوا بیوفائی کا
 بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکاتِ حسن دے اے جلوہ بینش! کہ مہر آسا
 چراغِ خانہ درویش ہو، کا سر گدائی کا
 نہ مارا جان کر بے جرم، غافل؛ تیری گردن پر
 رہا مانند خونِ بے گنسہ، حق آشنائی کا
 تمناے زباں محو سپاس بے زبانی ہے
 مٹا جس سے تھا ضا شکوہ بے دست مہمانی کا
 وہی اک بات ہے جو یاسِ نفسِ واں بھتِ گل ہے
 چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نواں کا
 دہانِ ہر بُتِ پیغا رہ جو زنجیرِ رسولی
 عدم تک بیوفا! چرچا ہے تیری بیونائی کا
 نہ دے نامے کو اتنا طول، غالب! مختصر لکھ دے
 کہ حسرتِ سنج ہوں، عرضِ بستمِ ہائے جدائی کا





گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا
بے تکلف وارِ غم، مہرِ دہاں ہو جائیگا
زہرہ گرا یاں ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پر تو مہتابِ سہیلِ خانماں ہو جائیگا
لے تولوں سوتے میں اُس کے پاتو کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگساں ہو جائیگا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھتے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ استحساں ہو جائیگا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ، گویا اک زمانہ مہرِ باں ہو جائیگا
گر نگاہِ گرم منسراتی رہی تسلیمِ ضبط
شملہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

باغ میں مجھ کو نہ لے جاؤ نہ میرے حال پر
 ہر گلِ ترا ایک چشمِ خوں نشاں ہو جائیگا
 واسے! گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
 اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا
 فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی دانا ہے استاد!
 دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائیگا



دردِ منت کش دوا نہ ہوا	میں نہ اچھتا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	اک تماشا ہوا، بگھلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں	تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتے شیریں ہیں تیرے لبِ کر قیب	گا لیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی	آج ہی گھر میں بویا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی حسدانی تھی؟	بندگی میں مرا بھسلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی	حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخمِ گردبِ گیا، لہو نہ تھا
 کامِ گرِ رُک گیا، روانہ ہوا
 رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؛ لے کے دل دلِ ستانی ہوا
 کچھ تو پڑھے، کہ لوگ کہتے ہیں
 ”آج غالبِ غزل سَرا نہ ہوا“



گلہ ہے، شوق کو، دل میں بھی تنگی جا کا
 گہر میں محو ہوا اضطرابِ دریا کا
 یہ جانتا ہوں کہ تو، اور پانچ مکتوب؛
 مگر ستمزدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا
 خائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
 دوا ہمِ تکلفِ خاطر ہے، عیشِ دنیا کا
 غمِ فراق میں، تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
 مجھے دماغ نہیں خندہ ہا سے بیجا کا

ہنوز محرمِ حسن کو ترستا ہوں
 کرے ہے ہر بُنِ مو، کامِ چشمِ بینا کا
 دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
 ہمیں دماغ کہاں محسن کے تقاضا کا!
 نہ کہہ کہ گریہ بہ مستدارِ حسرتِ دل ہے
 مری نگاہ میں ہے جمع و سرچِ دریا کا
 فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یادِ اسد!
 جفا میں اُس کی ہے اندازِ کارِ سرما کا



قطرہئے، بسکِ حیرت سے نفسِ پرور ہوا
 خطِ جامِ مے، سرا سرِ رشتہ و گہر ہوا
 اعتبارِ عشق کی حنائِ خرابی دیکھنا
 غیبر نے کی آہ! لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا





جب بہ تقریبِ سفر یار نے محلِ بانہا
 تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اک دلِ بانہا
 اہلِ مینش نے بہ حیرتِ تکریدہ شوخیِ ناز
 جو ہر آئینہ کو طوطیِ بسملِ بانہا
 یاس و اُنید نے یکِ غریبہ میسداں مانگا
 عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائلِ بانہا
 نہ ہندھے تشنگیِ شوق کے مضمونِ غالب !
 گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحلِ بانہا



میں، اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں !
 گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا !
 ہے ایک تیز جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
 وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالب! کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کُشا تھا



گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بھر گرج بھر نہ ہوتا، تو بیاہاں ہوتا
تنگی دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمر دُرع، بار تو دیتا بارے
کاشش رُخواں ہی دریا رکا دریاں ہوتا!



نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈھویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!
ہوا جب غم سے یوں بھیس تو غم کیا سر کے کٹنے کا!
نہ ہوتا اگر جُدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا ، پر یاد آتا ہے
وہ ہر ایک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟



ایک ذرہ زمیں نہیں بیکار بدغ کا
یاں جادہ بھی ، قیلید ہے لالے کے دغ کا
بے مئے ، کسے ہے طاقت آشوب آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایام کا
ببل کے کاروبار پہ ، ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق نخل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے نشہ منکر سخن مجھے
تریابیِ متدیم ہوں دودِ چسراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار
 یہ مسکدہ خراب ہے نئے کے سراغ کا
 باغِ شگفتہ تیرا باطنِ نشاطِ دل
 ابر بہار، تمسکدہ کس کے دماغ کا!



وہ مری چینِ جیس سے غمِ پنہاں سمجھا
 رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنوانِ سمجھا
 یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہمنوز
 چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
 شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
 اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
 بہ گمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
 رُخ پہ ہر قطرہ عسرقِ دیدہ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
 نبضِ خس سے تپشِ شعلہ سواں سمجھا
 سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
 ہر قدم سایے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
 تھا گریزاں مرثیہ یار سے دلِ تادمِ مرگ
 دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
 دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار اسد!
 غلطی کی کہ جو کافِ سر کو سداں سمجھا



پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا	دل جگر تشنہ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز	پھر تیرا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی	پھر وہ نیزنگِ نظر یاد آیا
عذر وماندگی اے حسرتِ دل!	نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا را ہگز یاد آیا
 کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا حُسد میں گریا د آیا
 آہ وہ جرات فریاد کہاں دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
 پھر ترے کو چے کو جال ہے خیال دل گم گشتہ گم یاد آیا
 کوئی دیرانی سی دیرانی ہے؛ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسلہ!
 سنگ اٹھایا تھا، کہ سر یاد آیا



ہوں تاخیر، تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا!
 آپ آتے تھے، مگر کوئی عمن گیر بھی تھا!
 تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
 اُس میں کچھ شائبہ خوبیِ تعدیر بھی تھا
 تو مجھے بھول گیا ہو تو پستابلا دوں
 کبھی فتراک میں تیرے کوئی پنچیر بھی تھا!

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
 ہاں کچھ اک رنج گراں باری زنجیر بھی تھا
 بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا!
 بات کرتے، کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا
 یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی
 گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائق تعزیر بھی تھا
 دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
 نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
 پیٹے میں عیب نہیں، رکھے نہ فرما د کو نام
 ہم ہی آشفۃ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
 ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ ہی
 آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا!
 پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پڑنا حق
 آدمی کوئی ہمارا دمِ تحسیر بھی تھا؛

ریختے کے ٹھیں استاد نہیں ہو، غالب!
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا



لب خشک در تشنگی مُردگاں کا زیارت کدہ ہوں دلِ زردگاں کا
ہمنا امید ہی ہمہ بدگانی میں دل ہوں فریبِ فنا خوردگاں کا



تو دوست کسی کا بھی ہستمگر! نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ بخشش کی طرح دستِ قضا نے
خُرشید ہمنوا اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں مُقتدرِ فتنہ و محشر نہ ہوا تھا

میں سادہ دل آزدوگی یار سے خوش ہوں
 یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا
 دریا سے معاصی ٹٹنگ آبی سے ہوا خشک
 میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
 جاری تھی، اسل! فارغ جگر سے مری تحصیل
 آتشکدہ، جاگیر سمندر نہ ہوا تھا



شب کہ وہ مجلس فردوز خلوت ناموس تھا
 رشتہ ہر شمع، خار کسوت فانوس تھا
 مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے خنا
 کس قدر یارب! ہلاک حسرت پابوس تھا
 حاصل الفت نہ دیکھا، جز شکست آزد
 دل بہ دل پیوستہ، گویا یک لب افسوس تھا
 کیا کہوں، بیماری عسم کی فراغت کا بیاں
 جو کہ کھایا خون دل، بے منت کیوس تھا

☆
 آئینہ دیکھ ، اپنا سا سُٹھ لے کے رہ گئے
 صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غور تھا !
 قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ مارے
 اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

☆
 عرضِ نیازِ عشق کے متاثر نہیں رہا
 جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا
 جاتا ہوں واغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
 ہوں شمعِ کُشتہ ، درِ خورِ محفل نہیں رہا
 مرنے کی ، اے دل ! اور ہی تدبیر کر کہیں
 شایانِ دست و بازو سے قابل نہیں رہا
 برُوے ششِ جہت درِ آئینہ باز ہے
 یاں استیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
 غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا
 گو میں رہا رہینِ ستمِ ہائے روزگار
 لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
 دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کرواں
 حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
 بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر، استاد!
 جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا



رشک کہتا ہے کہ، اُس کا غیر سے اخلاص حیف!
 عفتل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا!
 ذرہ ذرہ سا غریبِ مینا نہ نیزنگ ہے
 گردِ شسِ مجنوں پہ چٹک ہائے یلا آشنا

شوق ہے سماں ترا زنازشں اربابِ عجز
 ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا
 میں اور ایک آفت کا حکم ا وہ دل وحشی کرے
 عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
 شکوہ سنج رشک ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
 میرا زانو منس اور آئینہ تیرا آشنا
 کوہکن نقاش یک تماشای شیریں تھا اسد!
 سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا



ذکر اُس پری و شس کا اور پھر بیاں اپنا
 بن گیا رقیب آخر تھا جوارِ زداں اپنا
 مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب!
 آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
 منظر اک بسندی پر اور، ہم بنا سکتے
 عرش سے ادھر ہوتا، کاشکے نکاں اپنا! ۴۵

دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں مٹا لینگے
 بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں اپنا
 دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلا دوں
 انگلیاں نگار اپنی، خامسہ خونچکاں اپنا
 گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
 ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
 سا کرے نہ غمازی، کریسا ہے دشمن کو
 دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
 ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
 بے سبب ہوا، غالب! دشمن آسماں اپنا



سُرْمہٗ مُفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
 کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
 رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم!
 تیرے چہرے سے ہو ظاہرِ غم پہناں میرا



غافل، بہ وہم ناز، خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے سنا نہ، صبا نہیں طرہ گیاہ کا
بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کر زنگ
صیدِ زدام جستہ ہے اس دامگاہ کا
رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ
پر گئل خیال زخم سے دامن نگاہ کا
جاں در ہوا سے یک نگہ گرم بے اسد:
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا





خُور سے باز آئے ، پر باز آئیں کیا !
کہتے ہیں ، ہم تجھ کو مُسند دکھلائیں کیا !
رات دن گردش میں ہیں ، سات آسمان
ہو رہیگا کچھ نہ کچھ ، گھبراہٹیں کیا !
لاگ ہو ، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی ، تو دھوکا کھائیں کیا !
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب ! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا !
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا !
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر ، دیکھیے دکھلائیں کیا !
پوچھتے ہیں وہ کہ ، غالب کون ہے ؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا !



لطف بے کثافت، جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن، زنگار ہے آیینہ، یادِ بہاری کا
حریفِ جوشِ دریا، نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا



عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشِ کشِ چارہ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا
اب بھائے بھی ہیں محسوس ہم، اللہ اللہ!
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

ضعف سے گریہ مبتدل بہ دم سرد ہوا
 باور آیا ہمیں ، پانی کا ہوا ہو جانا
 دل سے مٹنا تری انگشتِ خانی کا خیال
 ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
 ہے مجھے ، ابر بہاری کا برس کر کھلنا
 روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
 گر نہیں کہتے گل کو ترے کوچے کی ہنوس
 کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
 بنختے ہے جلوہ گلِ ذوقِ تماشا غالب !
 چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا
 تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہواے صیقل
 دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا



ب

پھر ہوا دقت کہ ہو بال گشا موجِ شراب
 دے بٹائے کو دل و دستِ شُنا، موجِ شراب
 پوچھ مت وجہِ سیہِ مستی اربابِ چمن
 سایہِ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
 جو ہوا غرقہ 'مے'، بختِ رسا رکھتا ہے
 سرے گزے پہ بھی ہے بال ہما موجِ شراب
 ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے، اگر
 موجِ ہستی کو کرے، فیضِ ہوا موجِ شراب
 چار موجِ اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
 موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا موجِ شراب
 جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنہ رِناز
 دے ہے تسکین ہر دم آبِ بقا موجِ شراب

بسکِ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
 شہرِ رنگ سے ہے بالِ کشاموجِ شراب
 موجِ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
 ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
 نشے کے پردے میں ہے محو تماشاے دماغ
 بسکِ رکھتی ہے سر نشوونما موجِ شراب
 ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیتِ فصل
 موجِ سبزہ نوخیز سے تا موجِ شراب
 شرحِ ہنگامہ ہستی ہے زبے موسمِ گل !
 رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے ، خوشاموجِ شراب !
 ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ اسد !
 پھر ہوا وقت کہ ہو بالِ کشاموجِ شراب



ت

افسوس کہ دیدیاں کا کیا رزق فلک نے
 جن لوگوں کی تھی درخوہ عقیدہ گہرا انگشت
 کافی ہے نشانِ تری، پھلتے کا نہ دینا
 خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
 لکھتا ہوں، استبداد! سوزشِ دل سے سخن گرم
 تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت



رہا اگر کوئی تا قیامت سلامت
 بجز کو مرے عشقِ خونا بہ مشرب
 علی الزعم دشمنِ شہید و فاہوں
 مبارک مبارک سلامت سلامت
 پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت:
 لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت
 نہیں گرسرو برگِ ادر اکبِ معنی
 تماشاے نیرنگِ صورت سلامت

☆
 مُند گئیں، کھوتے ہی کھوتے آنکھیں غالب!
 یار لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت

☆
 آمدِ خط سے ہوا ہے سر و جو بازارِ دوست
 دُودِ شمع کُشتہ تھا، شاید خطِ رُخسارِ دوست
 اے دلِ نا عاقبت اندیش! ضبطِ شوق کر
 کون لا سکتا ہے تاپِ جلوہ دیدارِ دوست
 خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
 صورتِ نقشِ قدم، ہوں رفتہ رفتارِ دوست
 عشق میں، بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
 کُشتہ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست
 چشمِ مارو شن، کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے
 دیدہ پُر خوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

ق

غیر نین کرتا ہے میری پُرسش اُس کے ہجر میں
 بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
 تاکر میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک
 مجھ کو دیتا ہے پیغامِ وعدہ دیدارِ دوست
 جب کر میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعیفِ دماغ
 سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست
 مچکے مچکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے ، اگر
 ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفّارِ دوست
 مہربانی دے دشمن کی شکایت کیجیے
 یا بیباں کیجیے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست
 یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
 ہے ردیفِ شعر میں غالب! زبیر تکرارِ دوست



ج

گلشن میں بندوبست بزمِ دگر ہے آج
 قمری کا طوق، حلقہٴ بیرونِ در ہے آج
 آتا ہے ایک پارہٴ دل ہر فغاں کے ساتھ
 تیارِ نفس، کسبِ شکارِ اثر ہے آج
 اسے غایتِ کنارہ کر، اسے انتظام چل
 سیلابِ گریہ درپے دیوارِ در ہے آج



لو، ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
 اچھا اگر نہ ہو تو سیما کا کیا علاج



ج

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
 اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ
 کمالِ گرمی سہی تلاشیں دید نہ پوچھ
 برنگِ خارِ مرے آئے سے جو ہر کھینچ
 تجھے بہانہِ راحت ہے انتظارِ اے دل
 کیا ہے کس نے اشارہ کنازِ بستر کھینچ
 تری طرف ہے بہ حسرتِ نظارۂ رگس
 بہ کوریِ دل و چشمِ رقیبِ ساغر کھینچ
 بنیم غمزہ ادا کر حق و دیوتِ ناز
 نیامِ پردہ زخیمِ جگر سے خنجر کھینچ
 مرے قدح میں ہے صبا کے آتشِ جہاں
 بردے سفرہ کبساپِ دلِ مسند کھینچ

د

خس، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
 بارے آرام سے ہیں اہل جہا میرے بعد
 منصبِ شینگی کے کوئی متا بل نہ رہا
 ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد
 شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
 شعلہٴ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
 خوں ہے دل خاک میں احوالِ بہاں پر، یعنی
 اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ جہا میرے بعد
 درِ خورِ عسرض نہیں جو ہر بے داد کو جا
 نگہ ناز ہے سُر مے سے خفا میرے بعد

بے جنوں اہل بجنوں کے لیے آغوشِ وداع
 چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
 کون ہوتا ہے حریفِ بے مردِ افکنِ عشق
 ہے کز لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
 غم سے مڑتا ہوں کہ اتنا نہیں دخیامیں کوئی
 کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
 آئے بے کسی عشق پہ روزِ غالب!
 کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد



بلا سے، ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
 نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
 و فوراً شک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
 کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
 نہیں ہے سایہ، کہ کسُن کر نویدِ مقدمِ یار
 گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
 ہوئی ہے کس قدر ارزانی ہے جلوہ
 کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
 جو ہے تجھے سب سوداے انتظار تو آ
 کہ ہیں دکانِ مستاعِ نظر در و دیوار

ہجومِ گرہ کا سامان کب یا میں نے
 کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار
 وہ آ رہا مرے ہمسایے میں تو سایے سے
 ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
 نظریں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
 ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
 نہ پوچھ بخودی عیشِ مقدمِ سیلاب
 کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
 نہ کہ کسی سے کہ غالب، نہیں زمانے میں
 حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار



گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
 جانے گا اب بھی تو نہ برا گھر کہے بغیر
 کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
 "جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر"

کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
 یوے نہ کوئی نامِ ستگر کہے بغیر
 جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم
 سر جائے یار ہے، نہ رہیں پر کہے بغیر
 چھوڑ دنگائیں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
 چھوڑے نہ خلق کو مجھے کافر کہے بغیر
 مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
 چلتا نہیں ہے، دشمنہ و خنجر کہے بغیر
 ہر چہند ہو شاہدِ حق کی گفتگو
 بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر
 بہرا ہوں میں، تو چاہیے دونا ہوا التفات
 سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
 غالب ! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
 ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر



کیوں جل گیا نہ، تائبِ رُخِ یارِ دیکھ کر
جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدارِ دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شہرِ بارِ دیکھ کر
کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں، تم کو بے سبب آزارِ دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوارِ دیکھ کر
ثابت ہو اے گردنِ مینا پہ، خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مئے تری رفتارِ دیکھ کر
وا حسرتاً! کہ یار نے کھینچا بستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزارِ دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
 لیکن عیسٰی طبعِ حسریار دیکھ کر
 زنتار باندھ، سبھ صد دانہ توڑ ڈال
 رہز و چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
 ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
 جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر
 کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
 طوطی کا عکس سمجھ ہے زنگار دیکھ کر
 گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
 دیتے ہیں بادہِ ظریفِ قدحِ خواہ دیکھ کر
 سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہِ حال کا
 یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر





رزتا ہے مراد دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خاںِ میاں پر
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ پنجودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبتاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گریح کرتے پارہ ہاں سے دل نکلاں پر
نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہو سے مہرِ عناں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفقِ آلودہ ، یاد آیا
کہ فرقت میں تری ، آتشِ برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز، کیا باقی رہا ہوگا!
 قیامتِ اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر
 نہ لڑنا صبح سے، غالب کیا ہو اگر اُس نے شدت کی
 ہمارا بھی تو آہنِ زور چلتا ہے گریباں پر



ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
 کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
 یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
 دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
 ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند
 ہے تیر مقدر، مگر اس کی ہے کہاں اور
 تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اُٹھیں گے
 لے آئیں گے بازار سے جا کر دل دجاں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں
 ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہے سبک گراں اور
 ہے خون جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
 ہوتے جو کئی دیدہ خونابہ فشاں اور
 مڑتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند کہ سر اڑ جائے
 جلتا دکھ لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں" اور
 لوگوں کو ہے خُرشیدِ جہان تاب کا دھوکا
 ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
 لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چھین
 کرتا، جو نہ مڑتا کوئی دن، آہ و فشاں اور
 پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے
 رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور
 ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

☆
 صفاے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ رنگِ آخر
 تغیر، آبِ برجامانہ کا پاتا ہے رنگِ آخر
 نہ کی سامانِ عیش و خواہ نے تدبیرِ وحشت کی
 ہوا جامِ زمرّد بھی مجھے داغِ پلنگِ آخر

☆
 جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہونہ عریانی
 گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
 برنگِ کاغذِ آتشِ زدہ نیزنگِ بیتابی
 ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یکِ تپدین پر
 فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
 متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں مسترضِ رہزن پر
 ہم اور وہ بے سبب رنجِ آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
 شعاعِ مہر سے تہمتِ نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سوپ، گرم شتاق ہے اپنی حقیقت کا
 فروغِ طالعِ عاشاک ہے موقوفِ تجلّیٰ
 اسدِ بسل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
 کہ مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر



ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خواہاں تجھ پہ عاشق ہیں
 تکلفِ برطرف، بل جائیگا تجھ سارقیب آخر



لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
 تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور
 مٹ جائیگا سر، گر ترا چشم نہ گھسیگا
 ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
 آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
 مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو: قیامت کو ملینگے
 کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
 ہاں، اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف
 کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مَرتا کوئی دن اور
 تم ماہِ شب چار دہم تھے مرے گھر کے
 پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
 تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے!
 کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
 مجھ سے تھیں نفرت سہی، تیرے لڑائی
 پنجوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
 گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
 کرنا تھا جواں مرگ! گزرا کوئی دن اور
 ناداں ہو جو کہتے ہو کہ ”کیوں جیتے ہیں“ غالب!
 قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ز

فارغ مجھے نہ جان، کہ مانند صبح دہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفنِ ہنوز
ہے نازِ مغلّساں زہرِ از دستِ رفتہ پر
ہوں گلِ فروزشِ شوخیِ داغِ کہنِ ہنوز
مینا نہ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کہنے ہے بتِ بیدارِ فنِ ہنوز



حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب! کہ عمرِ خضر دراز
نہ ہو بہ ہرزہ، بیاباںِ نوردِ وہم و جود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز



وصال جلوہ تماشائے پردہ دلخ کہاں
 کہ دیجے آئینہ انتظار کو پرواز
 ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست
 گئی نہ خاک ہوئے پر ہوا سے جلوہ ناز
 نہ پوچھ وسعتِ میمنہ نہ جنوں غالب!
 جہاں یہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک انداز



وسعتِ سہی کرم دیکھ کہ سرتاسر خاک
 گزرے ہے آبلہ پا ابر گہر بار ہنوز
 یک دم کافور آتش زدہ ہے صفحہ دشت
 نقشِ پامیں ہے تب گرمی رفتار ہنوز

کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز
 کیسا نہیں ہے مجھے ایساں عزیز!

دل سے بکلا، پہ نہ بکلا دل سے
 ہے ترے تیسرے کا پیکان عزیز
 تاب لائے ہی بیگلی غالب !
 واقعہ سخت ہے اور جان عزیز



نہ گُلِ نفسہ ہوں نہ پردہ ساز
 میں ہوں اپنی شکست کی آواز
 تو، اور آرایشِ حسیم کا کل
 میں، اور اندیشہ ہاے دور دراز
 لافِ تمکیں : فریبِ سادہ دل
 ہم ہیں، اور رازِ ہاے سینہ گزار
 ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیتاد
 ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کر اُس ستمگر سے
 ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز
 نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
 جس سے مڑ گئیں ہوائِ نہ ہو گلِ باز
 اے تراغزہ، یک قلم انگیز
 اے تراظلم، سرِ بر انداز
 تو ہوا جلوہ گر، بُسارک ہو
 ریزشیں سجدۂ حبیبِ نیاز
 مجھ کو پوچھا، تو کچھ غضب نہ ہوا
 میں غریب اور تو غریب نواز
 اسد اللہ خاں تمام ہوا
 اے درویشا، وہ زندِ شاہِ باز!

س

مژدہ، اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے
 دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
 جگر تشنہ آزار، تسلی نہ ہوا
 جوئے خوں ہم نے بہائی، ہن ہر خار کے پاس
 مندرگئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
 خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
 میں بھی رُک رُک کے نہ مڑتا، جو زباں کے بدلے
 دُشمن اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
 دہن شیر میں جا بیٹھی، لیکن اے دل!
 نہ کھڑے ہو جیسے خوابِ دل آزار کے پاس
 دیکھ کر تجھ کو، چمن بس کہ نمو کرتا ہے
 خود بخود پہنچے ہے گلِ گوشہ دستار کے پاس
 مر گیا پھوڑ کے سرِ غالبِ وحشی ہے ہے!
 بیٹھنا اُس کا وہ، آکر تری دیوار کے پاس

ش

نہ یوے، گر خیں جو ہر طراوت ہنرہ خط سے
 لگائے خانہ آہیں نہ میں روئے نگار آتش
 فردغ حسن سے ہوتی ہے حق مشکل عاشق
 نہ نکلے شمع کے پاسے، نکالے گرنہ غار آتش

ع

جادہ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
 چرخ واکرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع





رُبَّ محارِے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گلِ آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ، خاموش
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
کرے ہے صرف بہ ایسے شعلہ نقدِ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فناءِ خوانیِ شمع
غم اُس کو حسرتِ پردا نہ کا ہے اے شعلہ!
ترے لرزے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع
ترے خیال سے روحِ اہتراز کرتی ہے
بہ جملہ ریزیِ بادو بہ پر فانیِ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بیسار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خسزانیِ شمع
جلے ہے، دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

ف

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیارِ حیف!
جتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتما می نفسِ شعلہ بار حیف!

ک

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نک
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نک
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نک



مجھ کو اِزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
 نالہٴ بلبِل کا درد اور خندہٴ گل کا نمک
 شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
 گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجبِ دریا نمک
 داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ واہ!
 یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جانک
 چھوڑ کر جانا تنِ مجسروحِ عاشق حیف ہے
 دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک
 غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیر درد
 زخمِ ہبلِ خندہٴ قاتل ہے سرتاپا نمک
 یاد ہیں غالب! تجھے وہ دن کہ جب ذوق میں
 زخم سے گرتا، تو میں پلوں سے پھتا تھا نمک





آہ کو چاہیے اک عمر اترہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سرہوتے تک
دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزریں بے قطرے پہ گہر ہوتے تک
عاشقی صبر طلب، اور تمنا بیستاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہوتے تک
ہم نے مانا کہ تعافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیگے ہم، تم کو خبر ہوتے تک
پر تو خور سے ہے شب بنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں، ایک عنایت کی نظر ہوتے تک
یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل!
گر می بزم ہے اک رقص شرر ہوتے تک
غم ہستی کا، اسد! کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

گ

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابتِ دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یکِ دلِ بے دُعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مُجھ سے مرے گُز کا حساب اے خدا نہ مانگ

ل

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفا سے گل
بُجُل کے کار و بار پہ ہیں خندہ ہا سے گل
آزادیِ نسیم بُسارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دامِ ہوا سے گل
جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے واے 'نالہ' لبِ خویش نوا سے گل !

خوش حال اُس حریفِ سیہِ مست کا کہ جو
 رکھتا ہو مثلِ سایہٴ گل، سر بہ پا سے گل
 ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار
 میرا قریب ہے نفسِ عطرِ مائے گل
 شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باؤ بیار سے
 مینا سے بے شرابِ دہلِ بے ہوا سے گل
 سطوت سے تیرے جلوہٴ حسنِ غمور کی
 خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادا سے گل
 تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
 بے اختیار دوڑے ہے گلِ درقضا سے گل
 غالب! مجھے ہے اُس سے ہم آغوشِ آرزو
 جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبا سے گل



م

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو پیش ازیک نفس
 برق سے کرتے ہیں روشن صبح ماتم خانہ ہم
 محفلیں برہم کرے ہے گنجمنہ باز خیال
 ہیں ورق گردانی نیزنگ یک بختخانہ ہم
 باوجود یک جہاں ہنگامہ، پسہانی نہیں
 ہیں چراغانِ شبتانِ دل پروانہ ہم
 ضعف سے ہے، نے قناعت سے یہ ترک جستجو
 ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم
 دائمِ اکبیس اس میں ہیں لاکھوں تمنا میں اسد:
 جانتے ہیں سینہ پرخوں کو زنداں خانہ ہم



☆
 بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فرام کر
 قلع خانہ زنجیر جز صد معلوم

☆
 مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
 رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
 وہ حلقہ ہائے زلف کیں میں ہیں اے خدا!
 رکھ لہجو میرے دعویٰ و استغی کی شرم

ن

لوں دامِ بختِ نختہ سے یک خوابِ خوش اُلے
 غالب! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں



وہ فراق اور وہ وصال کہاں
فرصتِ کاروبار شوقِ کسے
وہ شبِ دروز و ماہ و سال کہاں
ذوقِ نظارہٴ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودا سے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ عنائیٰ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں، ہو رونا
دل میں طاقتِ جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق
واں جو جائیں گہرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سرکھپا تاہوں
میں کہاں، اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ، غالب!

وہ عناصر میں اعتدال کہاں



کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جتنا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پردہ کیجیے کیا کہتے ہیں

اگے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو
 جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
 دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غم سے
 اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟
 ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا سجود
 قبلے کو، اہل نظر، قبلہ نما کہتے ہیں
 پائے افکار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
 خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
 اک شرِ دل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرا گیا
 اگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں
 دیکھیے، لاقی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
 اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں
 وحشت و شیفۃ اب مرثیہ کہیں شاید
 مرگیا غالبِ آشفستہ نوا، کہتے ہیں



آبرو کیا خاک اُس گُل کی کر گلشن میں نہیں
 ہے گریباں ننگ پیراہن، جو دامن میں نہیں
 ضعف سے اے گریہ، کچھ باقی مرے تن میں نہیں
 رنگ ہو کر اڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں
 ہو گئے ہیں جمع اجسزائے نگاہِ آفتاب
 ذرے اُس کے گھر کی دیو اہل کے روزن میں نہیں
 رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
 انجمن بے شمع ہے، گر برقِ خرمن میں نہیں
 زخم سلوانے سے، مجھ پر چارہ جونی کا ہے طعن
 غیر سمجھا ہے کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں
 بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
 جلوہ گُل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں
 قطرہ قطرہ، اک ہیولی ہے، نئے ناسور کا
 خوں بھی ذوقِ درد سے فناغِ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی سُخت، قلمِ آشامی مری
 موجِ مے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں
 ہو فشارِ ضعف میں کیسا ناتوانی کی نمود؛
 قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
 تھی وطن میں شان کیا، غالب! کہ ہو غربت میں قد
 بے تکلف، ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں



عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
 گرایک ادا ہوا تو اُسے اپنی قضا کہوں
 حلقے ہیں چشمِ ہائے کشادہ بسوے دل
 ہر تارِ زلف کو، نگہِ سرِ سا کہوں
 میں، اور صد ہزار نوا سے جگر خراش
 تو، اور ایک وہ نشیدن کہ کیا کہوں
 ظالم! مرے گماں سے تجھے منفعل نہ چاہ
 ہے ہے، خدا نکر وہ، تجھے بیوقوف کہوں! ۸۸

☆

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
 میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
 ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے
 بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
 زہر ہلتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر، ورنہ
 کیا قسم ہے ترے بننے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

☆

ہم سے کھل جاؤ بے وقتِ مئے پرستی ایک دن
 ورنہ ہم جھپٹریں گے، رکھ کر غنڈہ پرستی ایک دن
 غرۂ اوج بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
 اس بستی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
 قرض کی پیتے تھے مئے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں،
 رنگ لاؤ گی ہماری فاستہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل! غنیمت جانے
 بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن
 دھول دھپتا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
 ہم ہی کر بیٹھے تھے، غالب! پیش دستی ایک دن



ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گناہ نہیں
 اک چھوڑ ہے، وگرنہ مُرادِ امتحاں نہیں
 کس مُنہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
 پریش ہے اور پائے سخن دریاں نہیں
 ہم کو ستم عزیز، ہمتگر کو ہم عزیز
 نامہرِ باں نہیں ہے، اگر مہرِ باں نہیں
 بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی بھی
 آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

ق

ہر چند جاں گدازِ قبر و عتاب ہے
 ہر چند پشتِ گرمی تاب و تواں نہیں

جاں، مُطرب ترانہ "ہَلْ مِنْ مَرْنِیْن" ہے
 لب، پردہ سنج زمزمہ الاماں نہیں
 خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم
 دل میں چھری چھوڑے گر خونچکاں نہیں
 ہے ننگ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
 ہے عارِ دل، نفس اگر آذرِ نشاں نہیں
 نقصاں نہیں، جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
 سو گز زمیں کے بدلے سیاہاں گراں نہیں
 کہتے ہو، کیا لکھا ہے تری سرِ نوشت میں؟
 گویا جہیں پہ سجدہ بُت کا نشاں نہیں
 پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
 روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
 جاں ہے بہا سے بوسہ، دے کیوں کہے ابھو
 غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں



مانعِ دشتِ نوردی، کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے، مرے پاؤں زنجیر نہیں
شوقِ اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ، غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادہ راہِ فنا جس دم شمشیر نہیں
رنجِ نویدی جادید! گوارا رہو
خوش ہوں گرنالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے، جہاں زحیم سراپا ہو جائے
لذتِ سنگ بہ اندازہ تقریر نہیں
جب کرمِ رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر جس نخلتِ تقصیر نہیں

غالب! اپنا یہ عقیدہ ہے، بقولِ ناخ
”آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میر نہیں“

☆
 مت مرثکب دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ہیں جمع سوید اسے دل حشم ہیں آہیں

☆
 برشکالِ گریہ عاشق ہے، دیکھا چاہیے
 کھل گئی مانسہ گل سو جا سے دیوارِ حمن
 اُلفتِ گل سے غلط ہے دعویٰ دارِ شکی
 سرو ہے، باوصفِ آزادی گرفتِ ارچمن

☆
 عشقِ تاثیر سے نوید نہیں جاں سپاری شجرِ بید نہیں
 سلطنتِ دستِ بدستِ آن ہے جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
 ہے تھلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پروا خورشید نہیں
 رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
 گردشِ رنگِ طرب سے ڈھ ہے غمِ محسوسِ جاوید نہیں
 کہتے ہیں، جیتے ہیں امید پہ لوگ
 ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
 خیاباںِ خیاباںِ اِرم دیکھتے ہیں
 دلِ آشفٹگاں، خالِ گنجِ دہن کے
 سویدائیں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
 ترے سروِ قیامت سے اکِ قدِ آدم
 قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
 تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری!
 تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
 سُراغِ تَفِ نالہ لے داغِ دل سے
 کہ شبِ رُوح کا نقش قدم دیکھتے ہیں
 بنا کر فقیروں کا ہم بھیس، غالب!
 تماشا سے اہلِ کرم دیکھتے ہیں



ملتی ہے خوئے یار سے نازِ التہاب میں
کافر ہوں، مگر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں
شب ہائے حجب کو بھی رکھوں گِ حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے، رُخِ خطِ اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھینگے جواب میں
مجھ تک کب اُن کی بزم میں، آتا تھا دُورِ جام
ساقی نے کچھ بلانا دیا ہو شراب میں
جو مُسکِ رُوسِ ناہو، فریبِ اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
 ڈالا ہے تم کو وہم نے، کس ہیچ وقاب میں
 میں، اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے
 جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
 ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
 لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا
 لاکھوں بناؤ، ایک جگرنا عتاب میں
 وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے!
 جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
 وہ بحر، مدعا طلبی میں نہ کام آئے!
 جس بحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
 غالب! ٹھنٹی شراب، پر اب بھی، کبھی کبھی
 پیستا ہوں روزِ ابرو شبِ ماہِ تاب میں



کل کے لیے، کر آج زخمت شراب میں
یہ سو وطن ہے ساقی کوثر کے باب میں
میں آج کیوں ذلیل، کر کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں بکھنے لگتی ہے تن سے دم سماع
گر وہ صدا سمانی ہے چنگ و رباب میں
رو میں ہے رخس عمر کہاں دیکھے تھے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیسر سے ہوں بیچ و تاب میں
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں!
ہے مشتمل نمودِ صورت پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حساب میں

شرم ایک اداے ناز ہے اپنے ہی سے ہی
 ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
 آرایشِ جمال سے منارغ نہیں ہنوز
 پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
 ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
 ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں
 غالب! ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
 مشغولِ حق ہوں، بسندگی، کو تراب میں



حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جس کو میں
 مستدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
 چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
 ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟
 جانا پڑا قریب کے در پر ہزار بار
 اے کاش! جانا نہ ترے رگزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھے، میری بلا ڈرے
 کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
 لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
 یہ جانتا اگر، تو ٹھاتا نہ گھر کو میں
 چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
 پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
 خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
 کیا پوچھتا ہوں اُس بُتِ بیداگر کو میں؟
 پھر یہ بخودی میں بھول گیا راہ کوے یار
 جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خسر کو میں
 اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
 سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں
 غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمنہ تاز
 دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں



ذکر میرا، بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں،
 غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں
 وعدہ سیرِ گلستاں ہے خوشاطالعِ شوق!
 مژدہ قتلِ مقدر ہے جو مذکور نہیں
 شاہدِ ہستی مُطلق کی کمر ہے عالم
 لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں
 قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
 ہم کو تسلیمِ تنک ظہر فی منصور نہیں
 حسرت اے ذوقِ خرابی! کہ وہ طاقت نہ رہی
 حق پر غریبہ کی گوں تن رنجور نہیں
 میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں
 کس رعوت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

ظلم کر ظلم، اگر لطف درجے آتا ہو
 تو تغافل میں کسی رنگ سے معذہ نہیں
 صاف دُردی کش پیمانہ دہم ہیں ہم لوگ
 واسے ! وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں
 ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
 میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں



نالہ جز حسن طلب اے رستم ایجاد نہیں
 ہے تقاضائے جفا، شکوہ بیداد نہیں
 عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو، کیا خوب !
 ہم کو تسلیم نگو نامی سر باد نہیں
 کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
 دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھریاد نہیں

اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث، مکتب
 لطفِ موج کم از سیلِ استاد نہیں
 واسے! محرومیِ تسلیم و بدا! حالِ وفا
 جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
 رنگِ تمکینِ گلِ ولالہ، پریشاں کیوں ہے
 گر چراغِ ان سربِ رگزرِ باد نہیں
 سبِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
 مژدہ، اسے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں
 نفی سے کرتی ہے اثباتِ تراوش، گویا
 دی ہی جائے دہن اس کو دمِ ایجا نہیں
 کم نہیں، جلوہ گرمی میں ترے کوچے سے بہشت
 یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں
 کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایتِ غالب!
 تم کو بے مہسری یارانِ وطن یاد نہیں!



دونوں جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا
 پاں آپڑی یہ شرم کو تکرار کیا کریں
 تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
 تیرا پستانہ پائیں، تو ناچار کیا کریں!
 کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ، اہل بزم!
 ہو عزم ہی جاں گداز، تو غنوار کیا کریں!



ہو گئی ہے غیسر کی شیریں بیانی کارگر
 عشق کا اُس کو لگاں ہم بے زبانوں پر نہیں



قیامت ہے کہ سُن لیل کا دشتِ قیس میں آنا
 تعجب سے وہ بولا، "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں!"
 دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالب!
 نہ کر سرگرم اُس کا فسر کو اُلفت آزمائے میں

☆
 دل لگا کر، لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
 بارے، اپنی بی کسی کی ہم نے پائی داد یاں
 ہیں زوالِ آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
 مہر گردوں ہے، چسراغِ رگزارِ باد یاں

☆
 یہ ہم، جو محسوس میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
 کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
 وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے!
 کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
 نظر لگے نہ کہیں، اُس کے دست و بازو کو
 یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں!
 ترے جواہرِ طرَفِ کُلہ کو کیا دیکھیں!
 ہم ادجِ طالعِ نعل و گہر کو دیکھتے ہیں



نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ منہ راق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابرو باد نہیں
جو آؤں سامنے اُن کے تو مرجانہ کہیں
جو جاؤں داں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں!
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچہ میخانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب!
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں“



تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
 آہ کا کس نے اثر دکھایا ہے! ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
 تیرے فرصت کے مقابل اے عمر! برق کو پاہرِ حسنا باندھتے ہیں
 قیدِ ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں
 نشہِ رنگ سے ہے واشدِ گل مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
 غلطی ہائے مضامین مت پرچھ لوگ نام لے کر سا باندھتے ہیں
 اہل تدبیر کی داماندگیاں! آبلوں پر بھی حسنا باندھتے ہیں
 سادہ پرکار ہیں خواہاں غالب!
 ہم سے چیمانِ وفا باندھتے ہیں



زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد و گرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں



دامِ پڑا ہوا ترے دُر پر نہیں ہوں میں
 خاکِ ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردِ شبنمِ دماں سے گھبرانے جاے دل
 انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
 یارب ! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے ؟
 لوحِ جہاں پہ حرفِ کمر نہیں ہوں میں
 حد چاہیے سزا میں ، عقوبت کے واسطے
 آخر گناہ نگار ہوں ، کافر نہیں ہوں میں
 کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے ؟
 لعل و زُمر و زرد و گوہر نہیں ہوں میں
 رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ !
 رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
 کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے !
 کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
 غالب ، وظیفہ خوار ہو ، دوشاہ کو دُعا
 وہ دن گئے جو کہتے تھے ، تو کر نہیں ہوں میں



سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہونگی جو نہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی، رنگارنگ بزم آریاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ سیاں ہو گئیں
تھیں بناتِ انغش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
قیس میں، یعقوب نے، لی گو نریوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زمانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ مجاہدِ کینساں ہو گئیں
جو سے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھو نگا کہ شمعیں دوںد رواں ہو گئیں

اِن پر رزادوں سے لینگے حُلمِ میں ہم انتقام
 قدرتِ حق سے یہی، حویریں، اگر داں ہو گئیں
 نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے راتیں اس کی ہیں
 تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
 میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
 بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
 وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار
 جو مری کوتاہی قسمت سے مڑگاں ہو گئیں
 بس کر روکائیں نے، اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
 میری آہیں، بجھیں چاکِ گریباں ہو گئیں
 واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب!
 یاد تھیں جتنی دُعا میں صرفِ درباں ہو گئیں
 جانفز اے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
 سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگس جاں ہو گئیں

ہم نوجوہ ہیں ، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
 قیثیں جب بٹ گئیں ، اجڑاے ایماں ہو گئیں
 رنج سے خوگر ہوا انسان تو بٹ جاتا ہے رنج
 مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
 یوں ہی گر روتا رہا غالب ، تو اے اہل جہاں !
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں



دیوانگی سے ، دوش پہ زُنا رہی نہیں
 یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
 دل کو نیسا زِ حسرت دیدار کر چکے
 دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں
 ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
 دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اوریاں
 طاقت بخت بدر لذتِ آزار بھی نہیں
 شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر و بالِ دوش
 صحرائیں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں
 گنجائشِ عداوتِ اغیارِ ایک طرف
 یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
 ڈرنا رہا ہے زار سے میرے خدا کو مان
 آخر نوا سے مرغِ گرفتار بھی نہیں
 دل میں ہے یار کی صفِ بڑگاں سے روکشی
 حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
 اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!
 لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
 دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بار بار
 دیوانہ گر نہیں ہے تو ہیشیا بھی نہیں

ہم مُوجہ ہیں ، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
 فقیس جب مٹ گئیں ، اجڑاے ایماں ہو گئیں
 رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
 مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
 یوں ہی گردِ تارِ غالب ، تو اے اہل جہاں !
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں



دیوانگی سے ، دوش پہ نزار بھی نہیں
 یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
 دل کو نیازِ حسرت دیدار کر چکے
 دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
 ملتا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
 دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اوریاں
 طاقت بہت در لذتِ آزار بھی نہیں
 شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سروِ بالِ دوش
 صحرا میں اے خُدا! کوئی دیوار بھی نہیں
 گنجائشِ عداوتِ اغیارِ یک طرف
 یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
 ڈرنا لہے زار سے میرے حنہ کو مان
 آخر نواے مرغِ گرفتار بھی نہیں
 دل میں ہے یار کی صفِ بڑگاں سے رُوئی
 حال آنکہ طاقِ خلشِ خار بھی نہیں
 اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خُدا!
 لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
 دیکھا اسد کو خلوت و خلوت میں بار بار
 دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں



نہیں ہے زخمِ کوئی، بچنے کے درخوردِ مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہِ ویرانی
کعبہِ سیلابِ باقی ہے بزمِ پنبہ روزن میں
ودیعتِ خانہٴ بیداد کاوشِ ہائے شرکاء ہوں
نگین نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہِ خوں، تن میں
بیاں کس سے ہو غفلت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہجور رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
نکو ہش، مانعِ بے ربطی شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندہٴ احباب، بخیہ حبیبِ دامن میں
ہوئے اُس مہرِ دُش کے جلوہٴ تماشا کے آگے
پرافشاں جو ہر آئینے میں، مثلِ ذرہٴ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
 جو گل ہوں تو ہوں گلشن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
 ہزاروں دل دیے، جو شہس جنون عشق نے مجھ کو
 سیہ ہو کر سویدا ہو گیا، ہر قطرہ خوں تن میں
 اسد! زندانی تاثیرِ اُلفت ہائے خواباں ہوں
 خیم دستِ نواز شش ہو گیا ہے، طوق گردن میں



مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
 سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
 مگر غبار ہوئے پر، ہوا اڑالے جائے
 وگر نہ تاب و توانِ بال و پر میں خاک نہیں
 یہ کس بہشتِ شامِل کی آمد آمد ہے!
 کہ غیسرِ جلوہ گلِ رہزریں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی، کچھ مجھی کو جسم آتما
 اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں
 خیالِ جلوہ گل سے خراب ہیں میکش
 شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
 ہوا ہوں عشق کی غارِ گری سے شرمندہ
 سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں
 ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کئے اسدا !
 کھلا کر، سادہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں



دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں !
 روئینگے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں !
 دیر نہیں، حرم نہیں، دُر نہیں، آستان نہیں
 بیٹھے ہیں رہز پر ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں !

جب وہ جال ولفروز، صورتِ مہر نیم روز
 آپ ہی ہو نظارہ سوز پر دے میں منہ چھپائے کیوں !
 دشتِ غمزہ جاں ستاں ، نازِ بے پناہ
 تیرا ہی عکس رُخِ سہی ، سامنے تیرے آئے کیوں !
 قیدِ حیات و بندِ غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
 موت سے پہلے ، آدمی غم سے نجات پائے کیوں !
 حُسن اور اُس چُسنِ ظن ، رہ گئی بواہِ ہوس کی شرم
 اپنے پہ اعتماد ہے ، غیسر کو آزمائے کیوں !
 واں وہ غرورِ عزت و ناز ، یاں یہ حجابِ پاس وضع
 راہ میں ہم ملیں کہاں ، بزم میں وہ بٹائے کیوں !
 ہاں وہ نہیں خدا پرست ، جاؤ وہ بیوفا سہی
 جس کو ہو دین و دل عزیز ، اُس کی گلی میں جلے کیوں !
 غالبِ حسد کے بغیر کون سے کام بند ہیں !
 روئے زار زار کیا ، کیجیے ہائے ہائے کیوں !



”خُجّو، ہاں شگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ تُوں“
”بوسے کو پُوچھتا ہوں میں سُنھ سے مجھے بتا کہ تُوں“
”پُرسش طرزِ دلبسری کچھ سے کیا کہ بن کہے
”اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ تُوں“
رات کے وقت مئے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے دو یاں خُدا کرے، پر نہ کرے خُدا کہ یوں
غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا، تو دیکھے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یوں
بزم میں اُس کے زو برُو، کیوں نہ خموش بیٹھے
اُس کی تو خاموشی میں بھی ہے ہی مدعا کہ یوں
میں نے کہا کہ ”بزمِ ناز چاہے غیر سے تہی“
سُن کے ہستم ظریف نے مجھ کو اٹھایا کہ تُوں؟

مجھ سے کہا جو یار نے، جلتے میں ہوش کس طرح؟
 دیکھ کے میسری بخود ہی چلنے لگی ہوا کہ "یوں"
 کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
 آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں
 گر ترے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال
 موج، محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ "یوں"
 جو یہ کہے کہ "رنجیتہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی؟"
 "گُفۃُ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ "یوں"





”غُنجہ، ناسٹ گفٹہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں“
”بوسے کو پوچھتا ہوں میں سُنھ سے مجھے بتا کہ یوں“
”پُرسش طرزِ دلِ بوسری کیجیے کیا کہ بن کہے
”اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں“
رات کے وقت مئے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خُدا کرے، پر نہ کرے خُدا کہ یوں
غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا، تو دیکھیے
سامنے آن میٹھنا، اور یہ دیکھن کہ یوں
بزم میں اُس کے رُوبرُو، کیوں نہ خموش بیٹھیے
اُس کی تو خاشی میں بھی ہے یہی تہکا کہ یوں
میں نے کہا کہ ”بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی“
سُن کے ہستم ظریف نے مجھ کو اٹھادیا کہ یوں؟

مجھ سے کہا جو یار نے، جلاتے ہیں ہوش کس طرح؟
 دیکھ کے میسرے بخود می چلنے لگی ہوا کرتیوں
 کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
 آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشبِ پاکہ یوں
 گر ترے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال
 موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دستِ و پا کرتیوں
 جو یہ کہے کہ "رنجستہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی؟
 گُفَنۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کرتیوں"





غُمنچہ، ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کر یوں
بو سے کو پوچھتا ہوں میں، سنھ سے مجھے بتا کر یوں
”پیش طرزِ دلبسری کیجیے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کر یوں“
رات کے وقت نئے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خُدا کرے، پر نہ کرے خُدا کر یوں
غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا، تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کر یوں
بزم میں اُس کے رُوبرُو، کیوں نہ خموش بیٹھیے
اُس کی تو خاموشی میں بھی ہے ہی مدعا کر یوں
میں نے کہا کہ ”بزمِ ناز چاہیے غیر سے، تہی“
سُن کے ہستم ظریف نے مجھ کو اٹھایا کر یوں؟

مجھ سے کہا جو یار نے، جاتے ہیں ہوش کس طرح؟
 دیکھ کے میسرے بخودی چلنے لگی ہوا کرتیوں
 کب مجھے کُڑے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
 آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پاکہ یوں
 گر ترے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال
 موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دستِ و پا کرتیوں
 جو یہ کہے کہ رنجیتہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی؟
 گُفتہٗ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کرتیوں



و

صدے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو
 کہ چشم تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
 بقدرِ حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی
 بھروں یک گوشہ دامن اگر آبِ بہت دریا ہو
 اگر وہ سرو قد، گرم حشرام ناز آجائے
 کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ ثمری نالہ فرسا ہو



کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
 بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ گنہشت کو!
 طاعت میں تار ہے نہ مے و انگبیس کی لاگ
 دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہہ و رسمِ ثواب سے
 ٹیڑھا لگا ہے قِطْعَتِ لَمِ سرِ نوشت کو
 غالب! کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
 خرمن جلے، اگر نہ کُٹھ کھائے کشت کو



وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
 کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
 چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگِ اختلاط کا
 ہے دل پہ بارِ نقشبِ محبت ہی کیوں نہ ہو
 ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا بگلا
 ہرچند برسِیل شکایت ہی کیوں نہ ہو
 پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
 یوں ہو، تو چارۂ عنیمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
 اپنے سے کھینچتا ہوں، نجات ہی کیوں نہ ہو
 ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
 ہم انہن سمجھتے ہیں، حُلولت ہی کیوں نہ ہو
 ہنگامہ زبونی ہمت، ہے انفعال
 حاصل نہ کیجے دہرے، ہجرت ہی کیوں نہ ہو
 وارستگی بہانہ، بیگانگی نہیں
 اپنے سے کرنا غیرے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
 مٹا ہے فوٹ فرصت ہستی کا غم کوئی
 عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو
 اس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسد!
 اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو!





نفس میں ہوں، اگر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیسا ہے نواسنجان گلشن کو
نہیں گر ہمدی آساں، نہ ہوا یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی، خدایا! آرزو سے دوست دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو، اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں، مڑگان سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتلگاہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبش جو ہرنے آہن کو

ڈالا نہ بی کسی نے کسی سے معاملہ
 اپنے سے کھینچتا ہوں، نجات ہی کیوں نہ ہو
 ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
 ہم انجن سمجھتے ہیں، حُلولت ہی کیوں نہ ہو
 ہنگامہ زبونی ہمت، ہے انفعال
 حاصل نہ کیجے دہرے، رحمت ہی کیوں نہ ہو
 وارستگی بہانہ، بیگانگی نہیں
 اپنے سے کرتے غیرے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
 مٹا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
 عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو
 اس فتنہ خو کے درے اب اُٹھتے نہیں اسل
 اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو!





نفس میں ہوں، گرا چھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیسا ہے نوا سنجان گلشن کو
نہیں گر ہمدی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی، خدایا! آرزو سے دوست دشمن کو
نہ بکلا آنکھ سے تیری اک آنسو، اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں، مڑگان سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتلگاہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیستاب کاں میں جنبش جو ہرنے آہن کو

خوشی کیا، کھیت پر میرے، اگر سوار ابر آوے
 بکھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برقِ خرمن کو
 وفاداری بہ شرطِ استواری، اصل ایماں ہے
 مرے بُت خانے میں، تو کبے میں گاڑو برہمن کو
 شہادت تھی مری قسمت میں، جودی تھی یہ خو مجھ کو
 جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو
 نہ اُستادِ ن کو، تو کب راست کو یوں بیخبر سوتا
 رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو
 سخن کیا کہ نہیں سکتے، کہ جو یا ہوں جواہر کے
 جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھودیں جا کے معدن کو
 مرے شاہِ سیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب!
 فریادِ وِجھم وِکیخسرو وِداراب وِ بہمن کو



دھوتا ہوں جب میں مینے کو اُس سیمِ تن کے پانو
 رکھتا ہے، ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو

دی سادگی سے جسان، پڑوں کو کہن کے پانو
 ہیہات ! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
 بھاگے تھے ہم بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ
 ہو کر اسیر، دابے ہیں، راہزن کے پانو
 مرہم کی جستجو میں، پھسرا ہوں جو دُور دُور
 تن سے ہوا فگار ہیں، اِس خستہ تن کے پانو
 اندر سے ذوقِ دشتِ نور دی کہ، بعدِ مرگ
 ہلتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے پانو
 ہے جو ششِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
 اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مُرغِ چمن کے پانو
 شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں !
 دُکھتے ہیں آج، اُس بُستِ نازک بدن کے پانو
 غالب ! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
 پتیا ہوں دھوکے خسر و شیریں سخن کے پانو



واں اُس کو بولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شہسار
یعنی یہ میسری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ بزم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدہٴ پنجیر سے نہ ہو



واں پہنچ کر غمش آتا پیہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوس قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل، محوِ وفار کھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو
ضعف سے، نقشب پے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوپے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو!
جان کر کیجے تنِ فلفل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سہم ہے ہم کو

رشک ہم طرحی و درد اثر بانگِ حزیں
 نالہ مرغِ حسرت، تیغِ دودم ہے ہم کو
 سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر جا ہا
 ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
 دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ! ولیکن ناچار
 پس بے رونقی دیدہ، اہم ہے ہم کو
 تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
 ہم وہ عاجز کہ تنافل بھی ہستم ہے ہم کو
 قطع

لکھنو آنے کا باعث نہیں گھلتا، یحییٰ
 ہوس سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
 مقطعِ سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر
 عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
 یے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالب!
 جاوہرہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو



تم جانو، تم کو غیسرے جورم دراہ ہو
مجھ کو بھی پلو چھتے رہو، تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے
قابل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بیگنہ کششِ وحق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں، خرشید و ماہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتبا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب سیکہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
مُسنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تیرا جلوہ گاہ ہو
غالب بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دُنیا ہو، یارب ! اور مرا بادشاہ ہو



گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو!
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیوں کر ہو!
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو!
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
چیا ہے اور یہی گو گو، تو کیوں کر ہو!
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بُتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیوں کر ہو!
اُبلتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو!
جسے نصیب ہو، روزِ سیاہ، میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیوں کر ہو!
ہیں پھر اُن سے اُمید، اور اُنہیں ہماری تقدیر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ دو تو کیوں کر ہو!



تم جانو، تم کو غیسرے جورم دراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بیگنہ کششِ دحق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشیدِ ماہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتاہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میسکہ چٹھا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
مُسنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تیرا جلوہ گاہ ہو
غالب بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دُنیا ہو، یارب ! اور مرا بادشاہ ہو



گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو !
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیوں کر ہو !
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو !
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
جیا ہے اور یہی گو گوگو، تو کیوں کر ہو !
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بُتوں کی ہو اگر ایسی ہی ہو تو کیوں کر ہو !
اُبلتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو !
جسے نصیب ہو، روزِ سیاہ، میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو !
ہیں پھر اُن سے اُمید، اور اُنہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو !

غلط نہ تھا، ہمیں خط پر گناہ تسلی کا
 نہ مانے دیدہ دیدار ہو، تو کیوں کر ہو !
 بتاؤ، اُس مرثہ کو دیکھ کر ہو، مجھ کو قرار
 یہ نیش ہو رگ جاں میں فرد تو کیوں کر ہو !
 مجھے جنوں نہیں، غالب ! ولے بقول حضور
 "فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو !



کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو !
 نہ ہو جب دل ہی سنے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو !
 وہ اپنی خون چھوڑینگے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
 سُبکِ سرین کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو !
 کیا غمخوار نے رسوائے آگے اس جنت کو
 نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو !
 دُعا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پہوڑنا ٹھہرا
 تو پھر اے سنگِ دل، تیرا ہی سنگِ آساں کیوں ہو !

قفس میں مجھ سے زوداد چمن کہتے، نہ ڈر ہمدم!
 گری ہے جس پہ کل بھل وہ میرا آشیاں کیوں ہوا
 یہ کہہ سکتے ہو، ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ
 کہ جب دل میں تھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہوا
 غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
 نہ کھینچو گرم اپنے کو، کشاکش دریاں کیوں ہوا
 یہ فتنہ آدمی کی حسانہ ویرانی کو کیا کم ہے
 ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہوا
 یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں
 عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہوا
 کہا تم نے کہ کیوں ہو غیصر کے طے میں رُوانی
 بچا کہتے ہو، جج کہتے ہو، پھر کہو، کہاں کیوں ہوا
 ہکا لا چاہتا ہے کام کیسا طعنوں سے تو غالب
 ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں

غلط نہ تھا، یہیں خط پرگیاں تسلی کا
 نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیوں کر ہو!
 بتاؤ، اُس مژدہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار
 یہ نیش ہو رگِ جاں میں فردا تو کیوں کر ہو!
 مجھے جنوں نہیں، غالب! اولے بقولِ حضور
 "فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو!"



کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو!
 نہ ہو جب دل ہی سنے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو!
 وہ اپنی خونہ چھوڑینگے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
 سُبکِ سر بن کے کیا بچیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو!
 کیا غنوار نے رسوائی آگے اس محنت کو
 نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازِ داں کیوں ہو!
 دمنہ کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
 تو پھر اے سنگِ دل، تیرا ہی سنگِ آستان کیوں ہو!

نفس میں مجھ سے زوداد چمن کہتے نہ ڈر ہمد
 گری ہے جس پہ کل بجل وہ میرا آشیاں کیوں ہوا
 یہ کہہ سکتے ہو، ہم دل میں نہیں ہیں تپریہ بتلاؤ
 کہ جب دل میں تھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہوا
 غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
 نہ کھینچو گرم اپنے کو، کشاکش دریاں کیوں ہوا
 یہ فتنہ آدمی کی حسناہ ویرانی کو کیا کم ہے
 ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہوا
 یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں
 صدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہوا
 کہا تم نے کہ کیوں ہو غیبر کے طے میں جھوٹی
 بھانپتے ہو، صبح کہتے ہو، پھر کہو، کہاں کیوں ہوا
 بکالا چاہتا ہے کام کیسا طعنوں سے تو غالب
 ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں

رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
 ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
 بے درو دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
 کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
 پڑیے گریباڑ تو کوئی نہ ہو تہہ سار دار
 اور اگر مر جائیے تو نوم خواں کوئی نہ ہو

از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
 طوطی کو کشش جہت سے مقابل ہے آئینہ

ہے سبزہ زار ہر درو دیوارِ غمکدہ
 جس کی بہاریہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ
 ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
 دُشوار ہی رہ دستہم ہر ماں نہ پوچھ

می

صد جلوہ رُو بہ رُو ہے جو مڑگاں اٹھائیے
 طاقت کہساں کہ دید کا احساں اٹھائیے
 ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
 یعنی ہنوز منتِ طعناں اٹھائیے
 دیوارِ بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
 اسے خانماں خراب بنا حساں اٹھائیے
 یا میرے زخمِ رشک کو زسوا نہ کیجیے
 یا پردہ تبسم پنساں اٹھائیے



مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آگہ قبلہ حاجات چاہیے
 عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر
 آخرِ بستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک! دلِ مسرت پرست کی
 ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
 سیکھے ہیں سرِ زخوں کے لیے ہم مصوری
 تقریب کچھ تو بہرِ مافات چاہیے
 نئے سے غرضِ نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
 اک گونہ بخودی مجھے دن رات چاہیے
 ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
 ہر رنگ میں بہا کا اثبات چاہیے
 سزا ہے قلم پہ چاہیے ہنگامِ بخودی
 رُو، سوے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
 یعنی یہ حسبِ گردشِ پیمانہٴ صفات
 عارف ہمیشہ مستِ نئے ذات چاہیے
 نشو و نما ہے اصل سے، غالب! فروع کو
 خاموشی ہی سے نکلتے ہے جوبات چاہیے



بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہِ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیں بدنِ سرنگوں وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزر وہ ہم چندے تکلف سے
تکلفِ برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکینِ دلِ آزر وہ کونجے
میرے دامِ تمنائیں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاششِ نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدام!
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دُروں وہ بھی
نہ اتنا بُزِ شس تیغِ جفا پر نازِ فرماؤ
میرے دریا سے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
بے عشرت کی خواہشِ ساتی گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
میرے دل میں ہے غالب! شوقِ وصل و شکوہِ ہجر اس
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی



ہے بزمِ بستاں میں سخن آزر وہ لبوں سے
 تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
 ہے دورِ قدحِ وجہ پریشانی صہبا
 یک بار لگا دو خیمے میرے لبوں سے
 زندانِ درمیکدہ گستاخ ہیں زاہد!
 زہار نہ ہونا طرفِ ان بے ادبوں سے
 بیدادِ فنا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر
 ہر چند مری جان کو تھارِ ربط لبوں سے



تا، ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
 سن لیتے ہیں، گو ذکرِ ہمارا نہیں کرتے
 غالب! ترا احوالِ مُنادی گئے ہم اُن کو
 وہ سن کے بھالیں، یہ اجارا نہیں کرتے

✱
 گھر میں تمہا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
 وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیرِ سو ہے

✱
 غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
 فلک کا دیکھنا، تقریبِ تیرے یاد آنے کی
 کھلیگا کس طرح مضمونِ مرے مکتوب کا یارب!
 قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جَلانے کی
 لپٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
 ولے مشکل ہے حکمتِ دل میں سوزِ غم چھپانے کی
 اُنہیں منظور اپنے زخیموں کا دیکھ آنا تھا
 اُٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی
 ہماری سادگی تھی، اتفاتِ ناز پر مرنا
 بُرا آنا، نہ تھا ظالم! مگر تمہید جلنے کی

لگد کو بھڑکاؤ کا تحمل کر نہیں سکتی
 مری طاقت، کھانسی تھی تھیں کے ناز اٹھانے کی
 کہوں کیا خوبی اوضاعِ اسناے زماں غالب!
 بدی کی اس نے، جس سے ہم نے کی تھی بار بار نیکی



حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی!
 دل جو شش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
 اُس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بجھا دے
 میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ ناتمامی



کیا تنگ ہم بستم زدگاں کا جہان ہے
 جس میں کہ ایک بیضہ، نورِ آسمان ہے
 ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
 پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

حال آنکہ ہے یہ سیلی خارا سے لار رنگ
 غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
 کی اُس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا
 آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
 کیا خوب ! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
 بس چُپ رہو ہمارے بھی مُٹھ میں زبان ہے
 بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوارِ یار میں
 فرمانِ روا سے کشورِ ہندوستان ہے
 ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
 کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے
 ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
 غالب ! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے





درد سے میرے ہے تجھ کو بقراری، ہاے ہاے !
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری، ہاے ہاے !
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری، ہاے ہاے !
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دُشمنی اپنی تھی، میری دوستداری، ہاے ہاے !
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا !
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری، ہاے ہاے !
زہر لگتی ہے مجھے آبِ و ہوا سے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اُسے ناسازگاری، ہاے ہاے !
گلِ فشانِ ہاے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہاے ہاے !

شرمِ رسوائی سے، جا چھپنا نقابِ خاک میں
 ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری، ہاے ہاے !
 خاک میں ناموس پیمانِ محبت مل گئی
 اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری، ہاے ہاے !
 ہاتھ ہی تیغِ آزما کا کام سے جاتا رہا
 دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری، ہاے ہاے !
 کس طرح کاٹے کوئی شبِ ہاے تاہرِ برہنگال
 ہے نظرِ خورِ کردہ اختِ شماری، ہاے ہاے !
 گوشِ مہجورِ پیامِ وحشِ محسوسِ جمال
 ایک دل، تیس پرینا امیدواری، ہاے ہاے !
 عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب ! ابھی وحشت کا رنگ
 رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری، ہاے ہاے !





سُرسُتگی میں، عالمِ ہستی سے پاس ہے
تسکین کو دے نوید کو مرنے کی آس ہے
یستا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کویر سے ہی پاس ہے
کچے بیاں سُردِ تپِ غم کہاں تک
ہر نُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانہ و فاس
ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی، جس قدر طے شبِ ہتھاب میں شراب
اِس طبعی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر یک مکان کو ہے کمیں سے شرفِ اسد؛
بجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگلِ اُداس ہے



گر خاموشی سے فائدہ اخفاے حال ہے
خوشش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلد
دلِ فردِ جمع و خرجِ نیاں ہاے لال ہے
کس پر دے میں ہے آئینہ پر دانا کے خدا!
رحمت، کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے 'خدا' خواستہ، وہ اور دشمنی!
اے شوق! منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے
مشکیں لباسِ کعبہ، علیؑ کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصہٴ آفاق تنگ تھا
دریا، زمین کو عسرقِ انفعال ہے
ہستی کے ست فریب میں آجائیو، اسد!
عالمِ تمامِ حلفتِ دایم خیال ہے



تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
 حذر کرو مریے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
 ولا! یہ دردِ عالم بھی تو مُغْتَسِم ہے، کہ آخر
 نہ گریہِ سحری ہے، نہ آؤ نیم شبی ہے



ایک جاحظِ وفا لکھتا تھا، سو بھی مٹ گیا
 ظاہرِ اکاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
 جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر، نہ کیوں!
 ہم نہیں جلتے، نفس ہر چنڈِ آتش بار ہے
 آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
 ہر کوئی در ماندگی میں نالے سے ناچار ہے
 ہے وہی بدستی ہر ذرہ کا خود عذرا خواہ
 جس کے جلوے سے زمین تا آسمان ہر شار ہے

مجھ سے مت کہ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
 زندگی سے بھی برا جی ان دنوں بیزار ہے
 آنکھ کی تصویر سسڑناے پہ کھینچی ہے، کہ تا
 تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے



پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
 کدھا بھی بہت اروں کو بدلنے نہیں دیتے



مری ہستی، فضاے حیرت آباد مٹتا ہے
 جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا غنقا ہے
 خزاں کیا، فصل گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
 وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
 وفاے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہدم!
 اثر فریادِ دل ہاے حزیں کا کس نے دیکھا ہے!

نہ لائی شوخی اندیشہ تاپ رنج نویسی
کعبِ افسوس ملا، عہدِ تجدیدِ تمنا ہے



رحم کر، ظالم ! کہ کیا بود چراغِ کُشتہ ہے
نبضِ بیمار و منادِ دُودِ چراغِ کُشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی، سودِ چراغِ کُشتہ ہے



چشمِ خواہاں خاشی میں بھی نوا پر داز ہے
سُرمہ، تو کہوے کہ دودِ شعلہ آواز ہے
پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نار، گویا گردِ شسِ ستارہ کی آواز ہے
دستِ گاہِ دیدہ، خوبسارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوہ گل، فرشِ پا انداز ہے



عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی ہے
میری وحشت، تری شہرت ہی ہے
قطع کیجئے نہ، تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی ہے
میرے ہونے میں، ہے کیا سوائی؟
اے، وہ مجلس نہیں، خلوت ہی ہے
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے!
غیر کو تجھ سے محبت ہی ہے
اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی ہے
عمر ہر چند کہ ہے برق حنرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی ہے
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ ہی عشق، مصیبت ہی ہے

کچھ تو دے، اے فلکِ نانا انصاف !
 آہ و سربِ یاد کی رخصت ہی ہے
 ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
 بے نیازی تری عادت ہی ہے
 یارے چھیڑ چلی جائے، اسد !
 گز نہیں وصل تو حسرت ہی ہے



ہے آرمیدگی میں بکوش بجا مجھے
 صبحِ وطن ہے خندہٴ زنداں نما مجھے
 ڈھونڈے ہے اُس سُختی آتشِ نفس کو جی
 جس کی صد اُہو جلوةٴ برقِ فلک مجھے
 مستانِ طے کروں ہوں درہٴ وادیِ خیال
 تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہستِ گل سے حیا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ!
شعروں کے انتخاب نے دہوا کیا مجھے



زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب!
ہم بھی کیسا یاد کریں گے کاحِ خدا رکھتے تھے



اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں، اور جاؤں دُور سے ترے بنِ صدا کیے!
رکھتا پھر دوں ہوں خرقہ و سجتا دہ رہنمائی
مدت ہوئی ہے، دعوتِ آبِ دہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گر چہ عمرِ خضر
 حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کیے !
 مقدور ہوا تو خاک سے پوچھوں کہ اے نعیم !
 تو نے وہ گنج ہاںے گرا نہایہ کیا کیے ؛
 کس روز تہمتیں نہ ترا سنا کیے عدو
 کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کیے
 صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں ، یہ خو
 دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
 ضد کی ہے اور بات ، مگر خو بُری نہیں
 بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
 غالب ! تمہیں کہو کہ میگنا جواب کیا
 مانا کہ تم کہا کیے ، اور وہ سنا کیے





رفتارِ عمر، قطع رہِ اضطراب ہے
 اس سال کے حساب کو برقِ آفتاب ہے
 میناے مئے ہے سرو، نشاطِ بہار سے
 بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے
 زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
 نے بھاگنے کی گون، نہ اقامت کی تاب ہے
 جادادِ بادہ نوشی، رنداں ہے شش جہت
 غافل گماں کرے بے گمستی خراب ہے
 نظارہ کیا حریف ہو، اُس برقِ حسن کا
 جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے
 میں نامرادِ دل کی تسلی کو کیا کروں
 مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کا سیاب ہے

گُزرا اسد! سترتِ پیغامِ یار سے

قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے



دیکھا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گرا اندیشے میں ہے
آگ میں نہ شندی صہبائے پگھلا جائے ہے
غیر کو یارب، وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ نت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دُور چشم بد، تری بزم طرب سے واہ واہ!
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گزنا کہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزمِ آرایساں سُن کر دلِ رنجور، یاں
 مثلِ نقشِ مدعاے غیر مٹھیا جائے ہے
 ہو کے عاشقِ موہِ پری رُخ اور نازک بن گیا
 رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
 نقش کو اس کے مُصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
 کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھینچتا جائے ہے
 سایہ میسرا، مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسد!
 پاس مجھ آتشِ بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے!



گرمِ فریاد رکھا، شِکلِ نہالی نے مجھے
 تب اماں ہجر میں دی بُردِ یالی نے مجھے
 نسیمِ وفتہ دو عالم کی حقیقت، معلوم!
 لے لیا مجھ سے مری جنتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
 کر دیا کافرانِ اصنامِ خیالی نے مجھے
 ہو بس گل کا تصویر میں بھی کھٹکا نہ رہا
 عجب آرام دیا ہے پرو بالی نے مجھے



کارِ گاہِ ہستی میں لالہ داغِ ساماں ہے
 برقِ خرمینِ راحتِ خونِ گرمِ دھتتاں ہے
 غنچہ تماشا گشتِ ہا بر گبِ عاقبت معلوم
 بادِ جودِ دلجمعی، خوابِ گلِ پریشاں ہے
 ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے!
 داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہِ خسِ بنداں ہے



آگ رہا ہے درو دیوار سے سبزِ غالب!
 ہم بیاباں میں ہیں، ادر گھر میں بہار آئی ہے



سادگی پر اُس کی، مر جانے کی حسرت دلیں ہے
 بس نہیں چلتا کہ پھر مجھ سے کفِ قابل میں ہے
 دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
 میں نے یہ جانا کہ، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
 گرچہ ہے کس کس بُرائی سے، ولے با ایں ہر
 ذکر میرا، مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محصل میں ہے
 بس ہجومِ ناامیدی! خاک میں مل جائیگی
 یہ جو اک لذت ہماری سچی ہے حاصل میں ہے
 رنج رہ کیوں کھینچے، واما ندگی کو عشق ہے
 اُٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم سنزل میں ہے
 جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل بھی
 فتنہ، شورِ قیامت، کس کی آب و گل میں ہے؟
 ہے دل شوریدہ غالبِ ظہیرِ مہجِ قناب
 رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے



دل سئے تری نگاہ، جگر تک اتر گئی
دونوں کو پاک ادائیں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فرغ !
تکلیفِ پردہ داریِ زحسم جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں !
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی
اُڑتی پھرے ہے خاک مرئی کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ! ہوں بالِ وپر گئی
دیکھو تو دلہنہ ہی اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی ایک اگل کتر گئی
ہر بواہوس نے حسنِ پرستی شعار کی
اب آبروے شیوہ اہلِ نظر گئی
نظارتہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر کچھ گئی

فردا دودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
 کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
 مارا زمانے نے، اسد اللہ خاں! تمہیں
 وہ دلو لے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟



تسکیں کو ہم نہ روئیں جو فوقِ نظر ہلے
 جو راہِ حسد میں تری صورت مگر ہلے
 اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
 میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ہلے
 ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
 ہر شب پایا ہی کرتے ہیں تجھے جس قدر ہلے
 تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اسے ندیم!
 میرا سلام کہیو، اگر نامہ برسے
 تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
 فرصت کشائش غم نہاں سے گرے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
 مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
 اے ساکنانِ کوچہ دلدار! دیکھنا
 تم کو کہیں جو غالبِ آشفۂ سر ملے



کوئی دن، گر زندگانی اور ہے
 اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
 آتشِ دوزخ میں یہ گرمی، کہاں
 سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
 بارہا دیکھی ہیں، اُن کی رنجشیں
 پر کچھ اب کے سرگرائی اور ہے
 دے کے خط، مُنہ دیکتا ہے نامہ بر
 کُچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
 قاطعِ اعمار ہیں اکشر نجوم
 وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں، غالب! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُتسہد بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن مُعین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
جاننا ہوں ثوابِ طاعت و نذر پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چنچوں کہ یاد کرتے ہیں میسری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟
ہم دہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

کہے کس مُنہ سے جاؤ گے غالب!
شرمِ تم کو مگر نہیں آتی!



دلِ ناداں بستجے ہوا کیا ہے؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
 ہم ہیں مشتاق، اور وہ بیزار یا الہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
 میں بھی مُتھ میں زبان رکھتا ہوں کاشش پُو تھو کہ مُتھ کا کیا ہے؟



جب کہ تجھ بن نہیں کوئی مجھو پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
 یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزدہ و عیشو و ادا کیا ہے؟
 ممکن زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ نگہ چشمِ سرسہ سا کیا ہے؟
 سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟
 ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
 ہاں بھلا کر، تیرا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے
 جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب!
 مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے



کہتے تو ہر دم سب کہ بُتِ غالیہ مَو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ دَو آئے
ہوں کش مکش نزع میں، ہاں جذبِ محبت!
کچھ کہ نہ سکوں بہر وہ مرے پُر چنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مرنِ آتا نہیں، گو آئے
ظاہر ہے کہ، گھبرا کے نہ بھاگینگے نکیر بن
ہاں مُنٹھ سے مگر بادۂ دوشین کی بُو آئے
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے
ہاں اہل طلب! کون نے طعنہ نہایت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس دُر پہ نہیں بار، تو کہے ہی کو جو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
 اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے
 اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالب!
 ہم بھی گئے واں، اور تری تقدیر کو رو آئے



پھر کچھ اکِ دل کو بقراری ہے	سینہ، جو ایسے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن	آبدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز	پھر وہی پردہِ عساری ہے
چشم، دلالِ جنسِ بُروائی	دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی، صد رنگِ نالہ فرسائی	وہی، صد گونہ اشکباری ہے
دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر	محشرِ ستانِ بقراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے	روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اُسی بی وفا پر مرتے ہیں	پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز گرم بازارِ فوجداری ہے
 ہو رہا ہے جہان میں اندھیر زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے
 پھر دیا پارہ جگر نے سوال ایک فریادِ آہ و زاری ہے
 پھر ہوئے ہیں گواہِ عشقِ طلب اشکباری کا حکم جاری ہے
 دل و مثر گاہ کا جو مقدمہ تھا آج پھر اُس کی رو بکاری ہے
 بیخودی، بے سبب نہیں، غالب!
 کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے



جُنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
 نہکِ پاشِ خراشِ دل ہے لذتِ زندگانی کی
 کشاکشِ ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
 ہوئی زنجیر، موجِ آب کو، فرصتِ روانی کی

پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلان ہے
 شرابِ سنگ نے تربت پہ میری گلِ نشانی کی



نکو ہنس ہے سزا، فریادی بیدادِ دلبر کی
 مبادا خندہ دندانِ ثناب ہو صبحِ محشر کی!
 رُگِ سیلی کو خاکِ دشتِ مجنوںِ رنگی بخشے
 اگر بودے بجائے دانہ، دہقانِ نوکِ نشتر کی
 پر پروانہ شاید بادبانِ کشتی مئے تھا
 ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی ددِ ساغر کی
 کروں بیدادِ ذوقِ پر نشانیِ عرض، کیا قدرت!
 کس طاقتِ از گمنی، اُڑنے سے پہلے میرے شہر کی
 کہاں تک رُوؤں اُس کے خیمے کے چھچھ قیامت ہے
 بری قسمت میں یارب! کیا نہ تھی دیوارِ چمندر کی؟



بے اعتدالیوں سے بُک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دایم سخت، قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر!
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا اَلَم ہوئے
تیری دُنا سے کیا ہو تلافی، کہ دہر میں
تیرے سوا بھی، ہم پر بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے، جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قتل ہوئے
اللہ دی تیری تسندیٰ خواہ جس کے بیم سے
اجزائے مالِ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہل ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبرد عشق
 جو پاؤں اٹھ گئے، وہی اُن کے علم ہوئے
 نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
 جو واں نہ کھینچ سکے، سو وہیاں کے دم ہوئے
 چھوڑی اسل! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
 سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے



جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
 تو فسرِ دگی نہاں ہے، یکینِ بے زبانی
 مجھے اُس سے کیا توقعِ بزماںِ جوانی
 کبھی کو دکھی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
 یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا
 کہ ”مرے عدو کو، یارب! ملے میری زندگانی“



غفلت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
 اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
 نے مژدہ وصال، نہ نظارہ جمال
 مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے
 مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
 اے شوق! ہاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے
 گوہر کو عقدِ گردنِ خواہاں میں دیکھنا!
 کیا اوج پر ستارہ گوہرِ سرور ہے
 دیدارِ بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہِ مست
 بزمِ خیال میں کدہ بے خروش ہے
 قطع

اے تازہ واردانِ بساطِ ہواے دل!
 زہنہارا! اگر تمہیں ہوسِ نائے ونوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو
 میری سنو، جو گوشِ نصیحتِ نبوش ہے
 ساقی، یہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
 مُطرب، یہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
 یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہٴ بساط
 دامنِ باغبنان و کفِ گلِ فردش ہے
 لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
 یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
 یا صبحِ دم جو دیکھیے آکر، تو بزمِ میں
 نے وہ سُرور و سُور، نہ جوش و خروش ہے
 داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
 اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
 آتے ہیں غیب سے یہ مضامینِ خیال میں
 غالب! صریحِ سامہ، نوا سے سروش ہے



اگر مری جان کو تیار نہیں ہے
طاقتِ بیدارِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے بدلے
نشر بہ اندازۂ حُما نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
باے! کر دئے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ بائے معانی
غیر گلِ آیینہ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے
واسے، اگر عہدِ استوار نہیں ہے
تو نے قسم مے کشی کی کھائی بے غالب!
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے



ہجومِ غم سے یاں تک سترگوئی مجھ کو حاصل ہے
 کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
 رفوے زخم سے مطلب ہے لذتِ زخمِ سوزن کی
 سمجھی موت کہ پاس درو سے دیوانہ غافل ہے
 وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
 چٹکنا غنچہ گل کا، صدائے خندہ دل ہے



پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد
 خارِ پا ہیں جو ہر آئینہ زانو مجھے
 دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
 ہے نگاہ آشنا، تیرا سر ہر مو مجھے
 ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
 ہے یہی بہتر کہ، لوگوں میں نہ چھڑے تو مجھے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
 جاں، کالبندِ صورتِ دیوار میں آوے
 سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
 تو اس قدر دلکش سے جو گلزار میں آوے
 تب نازِ گراں مایگی اشک بجا ہے
 جب لختِ جگر دیدہ خونبار میں آوے
 دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر!
 کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
 اُس چشمِ فسوں گز کا اگر پائے اشارہ
 طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
 کانٹوں کی زباں سُکھ گئی پیاس سے یارب!
 اک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے
 مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک
 آغوشِ حسہِ حلفتِ زُنار میں آوے

غارتگر ناموس نہ ہو گر ہوس زر
 کیوں شاہِ گل باغ سے بازار میں آوے
 تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ ناداں!
 جب اک نفس اُلجھا ہوا ہوتا میں آوے
 آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
 اے واے! اگر معرضِ اظہار میں آوے
 گنجینہٴ معنی کا طلسم اس کو سمجھے
 جو لفظ کر، غالب! مرے اشعار میں آوے



حُسنِ مہر، گر چہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے
 اُس سے میرا مہر خُشیدِ جمال اچھا ہے
 بوسہ دیتے نہیں، اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
 جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
 اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
 ساغرِ جسم سے مرا جامِ سفاک اچھا ہے ۱۷۰

بے طلب دیں، تو مزا اُس میں سوا مٹا ہے
 وہ گدا، جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
 اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
 وہ سمجھتے ہیں کہ، بیمار کا حال اچھا ہے
 دیکھیے، پاتے ہیں محشاق بُتوں سے کیا فیض!
 اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
 ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
 جس طرح کا کسی میں ہو کمال، اچھا ہے
 قطرہ دریا میں جو مل جائے، تو دریا ہو جائے
 کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مائی اچھا ہے
 خضر سلطان کو رکھے حنائی اکبر سرسبز
 شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
 ہم کو معلوم ہے، جنت کی حقیقت، لیکن
 دل کے خوش رکھنے کو، غالب! یہ خیال اچھا ہے



نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ ہے
امتحان اور بھی باقی ہوا تو یہ بھی نہ ہے
خارِ حنا بہ المِ حسرت دیدار تو ہے
شوقِ گلچینِ گلستانِ تسلی نہ ہے
مے پرستاں! خُمِ مے مُنہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ ہے
نفسِ قیس کہ بے چشم و چراغ صحرایا
گر نہیں شمعِ سیہ حنا نہ لیلیٰ نہ ہے
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی ہے، نغمہ شادی نہ ہے
نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ ہے
عشرتِ صحبتِ خواہاں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی، غالب! اگر عسرِ طبعی، نہ ہے



عجب نشاط سے جلاؤ کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایے سے سُرپاؤ سے بہ دو قدم آگے
قصا نے تھا مجھے چاہا، خراب بادۂ اُلفت
فقط ”خراب“ لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
خدا کے واسطے دادِ اس جُنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھاتی ہیں ہم نے
تھارے آئیو، اے طرۂ باے خم بہ خم آگے
دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجِ جنوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے
قسمِ جواز سے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب!
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے



شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گلا ہوتا ہے
پُرہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک زرا چھڑیے پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوہ، جور سے، سرگرم جفا ہوتا ہے
عشق کی راہ میں ہے چرخِ لکوکب کی وہ چال
سُست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناکبِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں، گرتیرِ خطا ہوتا ہے
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا، پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

قطعہ

خامہ میسرا، کہ وہ ہے بارِ بیدِ بزمِ سخن
 شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے !
 اے شہنشاہِ کواکب سپہِ مہرِ علم !
 تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
 ساتِ تسلیم کا حاصل جو منرا ہم کیجے
 تو وہ لشکر کا ترے نعل پہا ہوتا ہے
 ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
 آسماں پر ترے ہم ناصیہ سا ہوتا ہے
 میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلِ خوانی میں
 یہ بھی تیرا ہی کرمِ ذوقِ فزا ہوتا ہے
 رکھیو، غالب ! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
 آج کچھ دردِ میرے دل میں ہوا ہوتا ہے



ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟
تھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟
نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخنِ تم سے
وگر نہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن
ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا
کھرید تے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشتِ عزیز
سوائے بادۂ کُلفِ نامِ مشکبو کیا ہے!

پیوں شراب، اگر خم بھی دیکھ لوں دوچار
 یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے!
 رہی نہ طاقِ گفتار، اور اگر ہو بھی
 تو کس ایسہ پہ کہیے کر، آرزو کیا ہے!
 ہوا ہے شہ کا مُصاحب، پھرے ہے اترتا
 وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے



میں انہیں چھڑوں، اور کچھ نہ کہیں
 چل نکلتے، جوئے پیے ہوتے
 قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو
 کا شکے، تم مرے لیے ہوتے!
 میری قسمت میں غم گر اُٹا تھا
 دل بھی یارب! کئی دیے ہوتے
 آہی جاتا وہ راہ پر، غالب!
 کوئی دن اور بھی جیے ہوتے



غیر لیں محفل میں ، بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا خم سے کیا شکوہ ، کہ یہ
ہنٹکھنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھینگے ، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پنی زمزم پہنئے ، اور صبح دم
دھوئے دھتے جسامِ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسا یا ، کیا اگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے ؟
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے ، کب دن پھریں حمام کے !
عشق نے غالب ! بھنا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے



پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہر تماشائی
 دیکھو اے ساکنانِ خطِ خاک! اس کو کہتے ہیں عالمِ آرائی
 کہ زمیں ہو گئی ہے سترِ اسر زو کشِ سطحِ چرخِ میسنائی
 سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا رُوئے آبِ پرکائی
 سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے چشمِ زر گس کو دی ہے مینائی
 ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادِ چیسائی
 کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی، غالب!
 شاہِ دیندار نے شفا پائی



تغافلِ دوست ہوں، میرا داغِ عجزِ عالی ہے
 اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی حالی ہے
 رہا آبادِ عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
 بھرے ہیں جس قدر جام و سُبُوہِ بخانہ خالی ہے



کب وہ سُنا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری
 غلٹیں غمزہ خوں ریز نہ پوچھ ! دیکھ خونا بہ فِشانی میری
 کیا بیاں کر کے مرا، روئنگے یار مگر آشفستہ بیانی میری
 ہوں زخود رفتہ بیدارے خیال بھول جانا ہے لُشانی میری
 مقابل ہے، مقابل میرا رُک گیا، دیکھ روانی میری
 قدِ سنگِ سرہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری
 گردِ بادِ رہِ بیستانی ہوں صرصر شوق ہے بانی میری
 دُہن اُس کا، جو نہ معلوم ہوا کھل گئی بیچ مدانی میری

کردیا ضعف نے عاجز، غالب !

ننگِ پیسری ہے جوانی میری



نقشِ نازِ بَستِ طُستاز، بہ آغوشِ رقیب
 پائے طاؤسِ پئےِ خامہ مانی مانگے

تو وہ بد خو کہ ، تھیتہ کو تماشا جانے
 غم وہ افسانہ کہ ، آشفستہ بیانی مانگے
 وہ تب عشق تمنا ہے کہ ، پھر صورتِ شمع
 شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے



گلشن کو تری صحبت از بس کہ خوش آئی ہے
 ہر غنچے کا گل ہونا ، آغوشِ کُشائی ہے
 واں گنگر استغنا ، ہر دم ہے بلندی پر
 یاں نالے کو اور اُلٹا دعوایِ رسائی ہے
 از بس کہ سکھاتا ہے عنم ضبط کے اندازے
 جو داغِ نظر آیا ، اک چشمِ ثنائی ہے



جس زحسم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رفو کی
 لکھ دیجو یارب ! اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرانگشتِ جنائی کا تصور
 دل میں نظر آتی تو ہے اک بوندِ لہو کی
 کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے وصلگی سے؟
 یاں تو کوئی سُنتا نہیں مسرِ یادِ کسو کی
 دشمنے نے کبھی مُٹھ نہ لگایا ہو جسگر کو
 خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
 صد حیف وہ ناکام، کہ اک عمر سے غالب !
 حسرت میں رہے ایک بُتِ عَرَبہ ہو جکی



سیما ب، پشتِ گرمی آمینہ دے پئے ہم
 حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے
 آغوشِ گلِ کشودہ برائے دداع ہے
 اے عنذیب ! چل کر چلے دن بہار کے

ہے وصل، ہجر، عالمِ تسکین و ضبط میں
 معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
 اُس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو، ہاں
 شوقِ فضول و جراتِ زندان چاہیے



چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے
 یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
 صحبتِ رنداں سے واجب ہے خدا
 جاے نئے، اپنے کو کھینچا چاہیے
 چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل!
 بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
 چاکِ مت کو، جیب، بے آیامِ گل
 کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

دوستی کا پردہ ، ہے بیگانگی
 مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
 دشمنی نے میسری کھویا غیر کو
 کس قدر دشمن ہے ، دیکھا چاہیے
 اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سہی
 یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
 منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
 نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے
 غافل ! اِن مہ طلعوں کے واسطے
 چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
 چاہتے ہیں خبر دیوں کو اسد
 آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے



ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
 میری رفتار سے بھاگے ہے ، بیاباں مجھ سے

درس عنوان تماشا، بہ تغافل خوشتر
 ہے نگہ رشتہ شیرازہ مژگاں مجھ سے
 وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں
 صورتِ دُود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے
 غمِ عشاق نہ ہو، سادگی آموزِ بستاں
 کس قدر حسانہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
 اثرِ آبلے سے، جسادِ صحرا سے جنوں
 صورتِ رشتہ نگو ہر ہے چراغاں مجھ سے
 بیخودی بسترِ تمہید فراغت ہو جو!
 پر ہے سایے کی طرح میرا بستاں مجھ سے
 شوقِ دیدار میں اگر تو مجھے گردن مارے
 ہونگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے
 بیکسی ہاں شبِ ہجر کی وحشت ہے، ہے!
 سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردش ساغر صد جلوہ زنجیں تجھ سے
 آئینہ داری یک دیدہ حیراں تجھ سے
 نگہ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے اسدا!
 ہے چراغاں، خس و خاشاک گلستاں تجھ سے



نکتہ چیں ہے، غم دل اُس کو سنائے نہ بنے
 کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
 میں بلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبہ دل
 اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
 کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
 کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
 غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ، اگر
 کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے
 اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں، تو کیا
 ہاتھ آئیں، تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہ سکے کون کہ یہ جلوہ گرمی کس کی ہے
 پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
 موت کی راہ نہ دیکھوں ؛ کہ بن آئے نہ رہے
 تم کو چاہوں ؛ کہ نہ آؤ ، تو بھلائے نہ بنے
 بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
 کام وہ آن پڑا ہے کہ بسائے نہ بنے
 عشق پر زور نہیں ، ہے یہ وہ آتشِ غالب !
 کہ لگائے نہ لگے ، اور بجھائے نہ بنے



چاک کی خواہش ، اگر وحشت بے دریانی کرے
 صبح کے مانند ، زخمِ دل گریبانی کرے
 جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ اگر کبھی خیال
 دیدہ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے
 ہے شکست سے بھی دل نو میز یارب ! کب تک
 آگینہ کوہ پر عرضِ گراں خسانی کرے

میکدہ گرچشم مست ناز سے پاوے شکست
 موعے شیشہ دیدہ ساغر کی مڑگانی کرے
 خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
 یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے



وہ آکے، خواب میں تسکین اضطراب تو دے
 ولے مجھے تپشیں دل، مجالِ خواب تو دے
 کرے بے قتل، لگاوٹ میں تیرا رد دینا
 تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
 دکھا کے جنبش لب ہی، تمام کر ہم کو
 نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
 پلا دے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
 پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے
 اسد! خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
 کہا جو اُس نے، زرا میسرے پانو داب تو دے ۱۸۸



پیش سے میری، وقف کش کش ہر تارِ بستر ہے
ہر اسر رنجِ بالیں ہے، ہر اتن بارِ بستر ہے
سرشکِ سر بہ صحرِ دادہ، نور العینِ دامن ہے
دل بے دست و پا افتادہ، پر خور دارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے
ہر طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شمعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بُوِ بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو، خوابِ زلیخا، عارِ بستر ہے
کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب!
کہ بے تابی سے ہر یک تارِ بستر، خارِ بستر ہے



خطر ہے، رشتہ اُلفت رگ گردن نہ ہو جائے
 غرور دوستی آفت ہے، ٹو دشمن نہ ہو جائے
 سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما، غالب!
 اگر گل سرو کے قامت پہ، پیرا ہن نہ ہو جائے



فریاد کی کوئی لئے نہیں ہے نامہ پاسبان لئے نہیں ہے
 کیوں بوتے ہیں باغباں تو نے؟ گرباغ گلے لئے نہیں ہے
 ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے
 ہاں، کھائی موت فریبِ بستی! ہر چند کہیں کر، ہے نہیں ہے
 شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے اُردی چونہ ہو تو دے نہیں ہے
 کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد! مے ہے میس کی قے نہیں ہے
 ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے غالب!
 آخر تو کیسا ہے، اے نہیں ہے؟



نہ پوچھ نسخہ، مرہم جراحستِ دل کا
کہ اس میں ریزہٴ الماس جزوِ عظام ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے



ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہسانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعشِ نو سیدی اربابِ ہوس ہے
غالب کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے



کرے ہے بادۂ ترے لب سے کسبِ رنگِ فردغ
خطِ پیالہ، سرا سر نگاہِ گلچیں ہے

کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے؛
 کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
 بجائے، گر نہ سُنے، نالہ ہائے بلبلِ زار
 کہ گوشِ گل، نغمِ شبِ ہم سے پُنبہ آگیاں ہے
 اسل ہے نزع میں چل بیوٹا! برائے خدا!
 مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے



کیوں نہ ہو چشمِ بہاں محوِ غافل، کیوں نہ ہو؛
 یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے
 مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی
 واسے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
 مارضِ گلِ دیکھ، رُو سے یارِ یاد آیا اسل!
 خوشِ فصلِ بہاری اشتیاقِ انگیز ہے



دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب، تو ہو، نامدبر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضاے شکوہ ہیں کس قدر ہے کیا کہیے !
رہے ہیں گہ و بے گہ، کر کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے ؛
زہے کرشمہ ! کیوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے !
بمکھ کے کرتے ہیں بازار میں، وہ پریش حال
کہ یہ کہے کہ، سر رہگزر ہے کیا کہیے ؛
تھیں نہیں ہے سرِ رشتہ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا کہیے !
انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑے
ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے ؛

حسد، سترائے کمال سخن ہے، کیا کیجے
 رستم، بہائے مستاع ہنر ہے کیا کہیے!
 کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں، لیکن
 سوائے اس کے کہ آشت سر ہے کیا کہیے



دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے
 کر گئی وابستہ تن میسری عریانی مجھے
 بن گیا تیغِ مگاہ یار کا سنگِ فداں
 مر جائیں! کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
 کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جمع ہے
 جانتا ہے محو پریش ہائے پنهانی مجھے
 میرے غمخانی کی قسمت جب رقم ہونے لگی
 لکھ دیا منجملہ اسبابِ ویرانی مجھے
 بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا، کاشکے!
 اس قدر ذوقِ نوائے مُرغِ بُستانی مجھے

واسے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
 لے گیا تھا گوریں ذوقِ تن آسانی مجھے
 وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟
 تم نے کیوں سوچی ہے میرے گھر کی درباری مجھے؟
 ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ!
 پھر ہوا ہے تازہ سوداے غزل خوانی مجھے
 دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
 میرزا یوسف ہے، غالب! یوسف ثانی مجھے



یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب! مجھے
 سمجھتا زاہد ہوا ہے، خستہ زیرِ لب مجھے
 ہے کشادِ خاطر وابستہ در، رہن سخن
 تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانہ مکتب مجھے
 یارب! اس آتشِ شعل کی داد کس سے چاہیے!
 رشکِ آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

طبع ہے شتاقِ لذت ہاے حسرت کیا کروں!
 آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
 دل لگا کر آپ بھی غالب۔ مجھی سے ہو گئے
 عشق سے آتے تھے مانج، میرزا صاحب مجھے



حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
 چمن میں خوش نوا یانِ چمن کی آزمائش ہے
 قد و گیسویں، قیس و کوہن کی آزمائش ہے
 جہاں ہم ہیں، وہاں دار و سن کی آزمائش ہے
 کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحاں آخر
 ہنوز اس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے
 نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنگاں کی ہوا خواہی!
 اُسے یوسف کی بُوسے پیرِ جن کی آزمائش ہے
 وہ آیا بزم میں، دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
 شکیب و صبر اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیرا اچھا، جگر کے پار ہو بہتر
 غرض شستِ بختِ ناوکِ فلن کی آزمائش ہے
 نہیں کچھ سچا و زنتار کے پھندے میں گیرائی
 وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
 پڑا رہ، اے دلِ وابستہ! بیتابی سے کیا حاصل؟
 مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے
 رگ و پے میں جب اترے زہرِ عنایت دیکھیے کیا ہوا!
 ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے
 وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالب!
 نئے فتوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے



کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گرا جائے ہے مجھ سے
 جفائیں کر کے اپنی یادِ ہشما جائے ہے مجھ سے
 خدایا! جذبہٴ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے!
 کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھینچا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی
 عبارتِ مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
 اُدھر وہ بدگسانی ہے، ادھر یہ ناتوانی ہے
 نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے
 سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی! کیا قیامت ہے!
 کہ دامانِ خیالِ یار، چھوٹا جائے ہے مجھ سے
 تکلفِ برطرف، نفلِ رگی میں بھی سہی ایسکن
 وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
 ہوئے ہیں پانو ہی پہلے، نہرِ عشق میں زخمی
 نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
 قیامت ہے کہ ہووے تدعی کا ہمسفرِ غالب!
 وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے!



زبکہ مشقِ تماشا بنوں علامت ہے
 کشاد و بست مرہ، یسلیِ ندامت ہے

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعن بد عہدی
 تجھے کہ آئینہ بھی ورطہ ملامت ہے
 بہ بیچ و تاب ہوس، سلکِ عافیت توڑ
 نگاہِ عجز سرِ رشتہ سلامت ہے
 وفا مست ابل و دعوائے عشق بے بنیاد
 جنونِ ساختہ و فصلِ گل، قیامت ہے!



لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جاؤں
 میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بے تلامدے تجھے
 کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آجائے رحم
 واں تلک کوئی کسی چلے پھنچاؤں
 مُٹھے نہ دکھلاؤں نہ دکھلاؤں پر بہ اندازِ عتاب
 کھول کر پردہ، زرا آنکھیں ہی دکھلاؤں
 یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہیں
 زلفِ گر بن جاؤں تو شانے میں اُبھاؤں



بازیچہ اطفال ہے، ڈیسائمرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا، مرے آگے
اک کھیل ہے، اورنگ سلیمان، مرے نزدیک
اک بات ہے، اعجازِ سیاحا، مرے آگے
جُز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں، ہستی اشیا، مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گردیں، صحرا، مرے ہوتے
گھستا ہے جہیں خاک پہ، دریا، مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا، مرے آگے
سچ کہتے ہو، خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں؛
بیٹھا ہے بُتِ آئینہ، سیما، مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی، گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ، صہبا، مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
 کیوں کر کہوں، لو نام نہ اُن کا مرے آگے
 ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
 کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے
 عاشق ہوں، پہ معشوقِ فرتجی ہے مرا کام
 مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے
 خوش ہوتے ہیں، پر و صل میں یوں مرنے جاتے !
 آئی شب، جہراں کی تمنا مرے آگے
 ہے موجزن اک مستلزمِ خونِ کاش ! یہی ہو
 آتا ہے ابھی دیکھیے، کیا کیا مرے آگے
 گویا تھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
 رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
 ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمارا ہے میرا
 غالب کو بُرا کیوں کہو، اچھا مرے آگے ؟



کہوں جو حال، تو کہتے ہو، مَدعا کہیے
تھیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے
نہ کیوں طعن سے پھر تم، کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے، کہ جو کچھ کہو، بجا کہیے
وہ میسر سہی، پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟
نہیں ذریعہٴ راحت، جراحِ پریاں
وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دکشا کہیے
جو مدعی بنے، اس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے، اُس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقتِ جانکا ہی مرضِ کئیے
کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کجیے
کبھی حکایتِ صبرِ گریزِ پا کہیے

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے
 کٹے زبان، تو خنجر کو مرجا کیے
 نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو، نگار تو ہے
 روانی روش و مستی ادا کیے
 نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
 طراوتِ چمن و خوبی ہوا کیے
 سفینہ جب کہ کنارے پہ آگیا غالب!
 خدا سے کیا رستم و جبرِ نا خدا کیے!



رونے سے، اور عشق میں میاں ہو گئے
 دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے
 صرف بہا سے ہوئے، آلاتِ میکشی
 تھے یہ ہی دو حسابِ سویوں پاک ہو گئے
 رُسوا سے دہر گو ہوئے، آوارگی سے، تم
 بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نازِ بے بس کو بے اثر؛
 پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
 پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا!
 آپ اپنی آگ کے نس و خاشاک ہو گئے
 کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم رگلہ
 کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
 اس رنگ سے اٹھائی کل اُس نے اسد کی نمش
 دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے



نشہ ہا سدا داپ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
 شیشہ رئے، سرورِ سبز جو بارِ نغمہ ہے
 ہمنشیں مست کہ کہ ”برجم کر نہ یزیم عیشِ دوست“
 واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے



عرضِ نازِ شوخیِ دنیاں، برائے خندہ ہے
 دعویٰ جمعیتِ اجابا جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ، محو عبرتِ انجمِ گل
 یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
 تکلفتِ افسردگی کو عیشِ بیستابی حرام
 ورنہ دندانِ دردِ دل افشردنِ بنائے خندہ ہے
 سوزشِ باطن کے ہیں احبابِ مسکر ورنیاں
 دل محیطِ گریہ و لبِ آشنائے خندہ ہے



حُسنِ بے پردا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
 آئینہ زانو کے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
 تاکجا، اے آگہی! رنگِ تماشا باضتن؟
 چشمِ داگر ویدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے



جب تک دہانِ زحسم نہ پیدا کرے کوئی
 مشکل کہ تجھ سے راہِ سخنِ داگرے کوئی
 عالمِ غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
 کب تک خیالِ طرۃِ یسلاکرے کوئی

افسردگی نہیں طربِ انشاے التفات
 ہاں، دردِ بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
 رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
 آخر کبھی تو، عفتدہٗ دل واکرے کوئی
 چاکِ جگر سے، جب رہ پرشش نہ واہونی
 کیا فائدہ کہ جیب کوڑھوا کرے کوئی
 نختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار، مشاخِ گل
 تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی
 ناکامی نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
 تو وہ نہیں کہ، تجھ کو تماشا کرے کوئی
 ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہر شکست
 نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی
 سربرِ ہونی نہ وعدہٗ صبرِ آزما سے غم
 فرصت کہاں کہ، تیری تماشا کرے کوئی
 ہے وحشتِ طبیعتِ ایجادِ یاس خیز
 یہ درد وہ نہیں کہ، نہ پیدا کرے کوئی

بیکاریِ جنوں کو، ہے سر پہنیے کا شعل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے، اسد!
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی



ابنِ مریم ہوا کرے کوئی میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار ہسی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟
چال، جیسے کڑی کمان کا تیر دل میں ایسے کسے جا کرے کوئی!
بات پر واں زبان کشتی ہے وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ! کچھ نہ سمجھے، حُسنِ ادا کرے کوئی
نہ سُنو، گر بُرا کہے کوئی نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے، جو نہیں ہے حاجت مند! کس کی حاجت ردا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے! اب کسے رہنما کرے کوئی؟
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب!
کیوں کسی کا گھلا کرے کوئی؟



بہت سہی عنسہ گیتی، شراب کم کیا ہے؛
غلام ساقی کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے؛
تمھاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر نطف، تو رستم کیا ہے؛
کٹے تو شب کہیں؛ کاٹے، تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ، وہ زلفِ خم بخم کیا ہے؛
لکھا کرے کوئی، احکام طالع مولود
کسے خبر ہے کہ، وہاں جنبشِ قلم کیا ہے؛
نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے، ایسے کی پھر قسم کیا ہے؛
وہ داد و دید گرا نمایہ شرط ہے، ہدم؛
وگر نہ مہرِ سلیمان و جام و جم کیا ہے؛
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے



باغ، پاکر خُفتانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
 سایہ سناخ گُل، انہی نظر آتا ہے مجھے
 جو ہر تیغ بہ سرِ چنہ، دیگر معلوم
 ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے
 مَدعا محو تماشاے شکستِ دل ہے
 آئینہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
 نالہ، سرمایہ یک عالم و عالم، کفِ خاک
 آسماں بیضہ قمری نظر آتا ہے مجھے
 زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
 دیکھوں، اب مر گئے پر، کون اٹھاتا ہے مجھے؟



روندی ہوئی ہے کوکہ شہسپا کی
 اترائے کیوں نہ خاک، سرِ رگزار کی
 جب اس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
 لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ ناری

بھوکے نہیں ہیں سیرگشتاں کے ہم، ولے
کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی



ہزاروں خواہشیں ایسی کر، ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل، کیا رہیگا اُس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشم تر سے عمر بھریوں دم بدم نکلے
ٹکنا حنڈ سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھل جائے ظالم! تیرے قامت کی درازی کا
اگر اُس طرۂ پُر ہیچ و حنم کا ہیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قتل نکلے
ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے، بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جسامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع ہستگی کی داد پانے کی
 وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغِ ستم نکلے
 محبت میں نہیں ہے فرق، جینے اور مرنے کا
 اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فر پہ دم اٹھلے
 کہاں یہ مٹانے کا دروازہ، غالبِ اور کہاں واعظ!
 پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے



کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جائیے
 بے تکلف، اے شہرِ رحمت کیا ہو جائیے
 بیضہ آستانِ گِ بال و پر پہ ہے کنجِ قفس
 از سر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے



مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
 موجِ شرابِ یکِ مژدہِ خوابِ ناک ہے
 جُز زحمتِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو
 جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسد!
صحرا ہماری آنکھ میں یک نشتِ خاک ہے



لبِ عیسیٰ کی جنبش، کرتی ہے گہوارہِ جُنبانی
قیامت، کُشتِ لعلِ بتاں کا خوابِ سُلگیں ہے



آبدِ سیلابِ طوفانِ صدا سے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُننگلی جاوہ سے
بزمِ مئے، دشتِ کدو ہے کس کی چشمِ مست کا؛
شیشیرِ نبضِ پری پہاں ہے، موجِ باد سے



ہوں میں بھی تماشا شانیِ نیزنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی براوے



سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحسیر کا غرپر
ہری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجر کی



ہجومِ نالہ، حیرت، عاجزِ عرضِ یکِ انہاں ہے
 خموشیِ ریشہٴ صدِ نیساں سے خسِ بنداں ہے
 تکلفِ برطرف، ہے جاںِ تاں تر لطفِ بدخویاں
 نگاہِ بے حجابِ نازِ تیغِ تیسرِ عریاں ہے
 ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف، کیفیتِ شادی
 کہ صبحِ عید، مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے
 دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
 کہ اس بازار میں ساغر، متاعِ دستِ گداں ہے
 غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے، عاشق کو
 چراغِ روشن اپنا، قلمِ صرصر کا مرجاں ہے



خموشیوں میں تہماشا ادا نکلتی ہے
 نگاہ، دل سے ترے، سُرمہ سا نکلتی ہے

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبِ بنم
 صبا جو غمغئے کے پردے میں جا بھٹکتی ہے
 نہ پوچھ سینہ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
 کہ زخمِ روزِ در سے ہوا بھٹکتی ہے



جس جاں نسیم شانِ کیش زلفِ یار ہے
 نافر، دماغِ آہو سے دشتِ تار ہے
 کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو؟ اے خدا!
 آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے
 ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبارِ شوق
 گردِ ام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے
 دلِ مدمعی و دیدہ بنا ندعا علیہ
 نظارے کا مفتِ دم پھر رو بکار ہے
 چھڑکے ہے شبِ بنم آئینہ برگِ گل پر آب
 اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے

بیچ آپڑی ہے وعدہ دہار کی مجھے
 وہ آئے یا نہ آئے، یہاں انتظار ہے
 بے پردہ سوسے دادی مجنوں گزرنہ کر
 ہر ذرۂ کے نقاب میں دل بیقرار ہے
 اے عندلیب! یک کفنِ خس بہرِ آشاں
 طوفانِ آمد آمدِ فصل بہار ہے
 دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی
 اے بے دماغ! آئینہ تھال دار ہے
 غفلت کفیلِ عمرو اسدِ ضامنِ نشاط
 اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے



کہ مینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں ہے
 ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں ہے
 حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
 گلدستہ نگاہ، سویدا کہیں ہے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبتیں اے خدا!
 افسوس انتظارِ تمنا کہیں ہے
 سر پہ، ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالے
 وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحر ا کہیں ہے
 ہے چشمِ تریں حسرتِ دیدار سے نہاں
 شوقِ عیناں گسختہ، دیا کہیں ہے
 درکار ہے، شگفتنِ گلہائے عیش کو
 صبحِ بہار، پُنبہٴ مینا کہیں ہے
 غالب! بُرا نہ مان، جو واعظِ بُرا کہے
 ایسا بھی کوئی ہے کہ، سب اچھا کہیں ہے؟



شبِ نیمِ بر گُلِ لالہ، نہ خالی زاد ا ہے
 داغِ دلِ بیدردِ نظرِ گاہِ حیا ہے
 دلِ خوں شدہٴ کشِ کشِ حسرتِ دیدار
 آئینہٴ بدستِ بُستِ بدستِ عینا ہے

شعلہ سے نہ ہوتی، ہوس شعلہ نے جو کی
 جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے؟
 تماشائیں تیری ہے وہ شوخی کُ بصد ذوق
 آئینہ بہ اندازِ گل، آغوش کُشا ہے
 قمری کفِ خاکستر و بیلِ قفسِ رنگ
 اسے نالہ، نشانِ جگر سوختہ کیا ہے؟
 خُونے تری افسردہ کیا، وحشتِ دل کو
 مشوقِ دے وصلی، طُرفِ بلا ہے
 مجبوری و دعا سے گرفتاریِ اُلفت
 دستِ تہِ سنگِ آمدہ، پیمانِ وفا ہے
 معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
 تیغِ ستم، آئینہ تصویرِ نما ہے
 اسے پر تو خرمشیدِ جہانِ تاب! ادھر بھی
 سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ٹے داد
 یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
 بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو، غالب!
 کوئی نہیں تیرا تو ہری جان! خدا ہے



منظور تھی یہ شکل، تجسلی کو نور کی
 قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی
 اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
 پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر خور کی
 واعظ! نہ تم ہیو، نہ کسی کو پاس کو
 کیا بات ہے تمہاری شرابِ ظہور کی!
 لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
 گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صور کی
 آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج
 اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طيور کی

گوداں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے توہیں
 کعبہ سے ان بُتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
 کیا فرض ہے کہ سب کو بڑے ایک سا جواب !
 آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
 گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر
 کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی
 غالب ! گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
 حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی



غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
 یہ رنج کو کم ہے مے گلِ قائم بہت ہے
 کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے دُور نہ
 ہے یوں کہ مجھے دُرو تہِ جام بہت ہے
 نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کیس میں
 گوشے میں فتنس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
 پاداشِ عمل کی طمعِ حرام بہت ہے
 ہیں اہلِ خرد، کس روشِ خاص پہ نازاں؟
 پابستگیِ رسم و ردِ عام بہت ہے
 زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے
 آلودہ بہ مئےِ جامہٴ احرام بہت ہے
 ہے قہرِ گراب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو
 انکار نہیں، اور مجھے ابرام بہت ہے
 خون ہو کے جگر آگ لگے ٹپکا نہیں لے مرگ!
 رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
 ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
 شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے



مدت ہوئی ہے یار کو مہاں کیے ہوئے
 جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر، جگر نخت نخت کو
 عرصہ ہوا ہے دعوتِ مرثاں کیے ہوئے
 پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
 برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
 پھر گرم نالہ لائے شہر بار ہے نفس
 مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے
 پھر پریش جراحِ دل کو چلا ہے عشق
 سامانِ صد ہزار نمکدہاں کیے ہوئے
 پھر بھر رہا ہوں خامسہ مرثاں بخونِ دل
 سازِ چمن طسرازی داماں کیے ہوئے
 باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
 نظارہ و خیال کا سامان کیے ہوئے
 دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جلائے ہے
 پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
 پھر شوق کر رہا ہے حسریدار کی طلب
 عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دُڑے ہے پھر ہر ایک گلِ دلاہِ پُریاں
 صد گستاں نگاہ کا سماں کیے ہوئے
 پھر چاہتا ہوں، نامہٴ دلدار کھولنا
 جاں، نذرِ دلِ نسریٰ عِناں کیے ہوئے
 مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بامِ پر ہوس
 زلفِ سیاہِ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
 چاہے ہے پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو
 سُرمہ سے تیز دشنہٴ مژگاں کیے ہوئے
 اکِ نو بہارِ ناز کو تار کے ہے پھر، نگاہ
 چہرہٴ فردغِ مئے سے گستاں کیے ہوئے
 پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
 سرِ زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
 جی، ڈھونڈتا ہے پھر، وہی فرصتِ کُرّاتِ دن
 بیٹھے رہیں تصویرِ جاناں کیے ہوئے
 غالب! ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
 بیٹھے ہیں ہم تہینہٴ طوفاں کیے ہوئے



فویہ امن ہے بیدارِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ہستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے، گر مژدہ یارِ تشنہ خوں ہے
دکھوں کچھ اپنی بھی مرگنِ خوں فناں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اُسے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی میں مبتلا سے آفتِ رشک
بلا سے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے
فلک! نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہمِ خسِ آشیاں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنا سے غزل
 کچھ اور چاہیے وسعت، مہرے بیاں کے لیے
 دیا ہے خلق کو بھی، تانا سے نظر نہ لگے
 بنا ہے عیشِ تجملِ حسینِ خاں کے لیے
 زباں پہ بارِ حُسد آیا! یہ کس کا نام آیا؟
 کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
 نصیرِ دولت و دیں اور معینِ بہت و ملک
 بنا ہے چرخِ بریں جس کے آسماں کے لیے
 زمانہ عہد میں اُس کے ہے محورِ آرایش
 بنینگے اور ستارے اب آسماں کے لیے
 وُرقِ تمام ہوا، اور مدحِ باقی ہے
 سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے
 اداسے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
 صلاے عام ہے یا رانِ نکتہ داں کے لیے!



☆ منقبت میں

سازِ یک ذرہ ، نہیں فیضِ چمن سے بیکار
 سایہ لالہ بیدارِ غم ، سویدا سے بہار
 مستی بادِ صبا سے ، ہے بہ عرصِ سبزہ
 ریزہ شیشہ مے ، جو ہر تیغِ کہسار
 سبز ہے ، جامِ زمرہ کی طرح داغِ پلنگ
 تازہ ہے ، ریشہ نارنجِ صفتِ رُو کے شرار
 مستی ابر سے ، گلچینِ طرب ہے حسرت
 کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
 کوہِ و صحرا ہمہ معمورِ شوقِ لبّ لبّ
 راہِ خوابیدہ ہوئی خندہ گل سے بیدار
 سوئے ہے فیضِ ہوا ، صورتِ مرغانِ یتیم
 سرِ نوشتِ دو جہاں ابر ، بیکِ سطرِ غبار
 کاٹ کر پھینکیے ناخن ، تو بہ اندازِ ہلال
 قوتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

کف ہر خاکِ بگردوں شدہ، تری پرواز
 دامِ ہر کاغذِ آتشِ زودہ، طاؤسِ شکار
 میسدے میں ہوا اگر آرزوے گلِ حسینی
 بھول جا، یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار
 موجِ گلِ ڈھونڈ بھلو تکدہ غنچہ باغ
 گرم کرے گوشہ میخانہ میں گرتو دستار
 کھینچے گر مانی اندیشہ، چمن کی تصویر
 سبز مثل خطِ نوخیز، ہو خطِ پرکار
 اعلیٰ سی، کی ہے، پے زمزمہ بدحتِ شاہ
 طوطی سبزہ کہار نے پیدا بنقار
 وہ شہنشاہ کہ، جس کی پے تعمیرِ سرا
 چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
 فلکِ العرش، هجومِ خمِ دوشِ مزدور
 رشتہ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار
 سبزہ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
 رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پر کاہ
 وہ رہے مروحہ بال پر ی سے بیزار
 خاک صحرا سے نجف، جو ہر سیر غرنا،
 چشم نقش قدم، آئینہ بخت بیدار
 ذرہ اس گرد کا، خورشید کو آئینہ ناز
 گرد اس دشت کی، اُمید کو، احرام بہار
 آفرینش کو ہے واں سے طلبِ ستی ناز
 عرضِ خیاضۂ ایجاد ہے، ہر موجِ غبار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستان بہار!
 دل پروانہ چہ سراغاں، پر بلبلِ گلزار
 شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
 ذوق میں جلوے کے تیرے بیوے دیدار
 تیری اولاد کے غم سے ہے بروے گردوں
 سلکِ اختر میں مہر نو، مژدہ گو ہر بار

ہم عبادت کو، ترا نقش قدم، مہرِ نواز
 ہم ریاضت کو، ترے وصلے سے انتظار
 مدح میں تیری نہاں، زمزمہٴ نعتِ نبی
 جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار
 جو ہر دستِ دعا آئینہ، یعنی تاثیر
 یک طرفِ نازشِ مرثگان و دگر سو غمِ خار
 مُردِ مک سے ہو عزِ خانہٴ اقبالِ نگاہ
 خاکِ در کی ترے، جو چشم نہ ہو آئینہ دار
 دشمنِ آلِ نبی کو، بہ طرب خانہٴ دہر
 عرضِ خمیازہٴ سیلاب ہو، طاقِ دیوار
 دیدہ تاملِ اسدل، آئینہٴ یک پر تو شوق
 فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار

منقبت میں

دہر، جُز جلوۂ یکسانیِ مستوق نہیں
 ہم کہاں ہوتے، اگر حُسن نہ ہوتا خودیں

بیدل ہاے تماشا! کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
 بیکسی ہاے تماشا! کہ نہ دُنیا ہے، نہ دیں
 ہرزہ ہے نغمہٴ زیر و بم، ہستی و عدم
 لغو ہے آئینہٴ فرقِ جنون و تمکین
 نقشِ معنی ہم، خمیازہٴ عرضِ صورت
 سخنِ حق ہم، پیمانہٴ ذوقِ تمکین
 لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم!
 دُرِ دیک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں
 مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم
 صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکین
 عشق، بے ربطی شیرازہٴ اجزائے حواس
 وصل، زنگارِ رخِ آئینہٴ حُسنِ یقین
 کوکب، گرسنہٴ مزِ دورِ طرب گاہِ رقیب
 بے ستوں آئینہٴ خوابِ گرانِ شیریں
 کس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتشِ خیز؟
 کس نے پایا، اثرِ نالہٴ دہائے حزیں؟

سامع زمزمہ اہل جہاں ہوں، لیکن
 نہ سرو و برگ ستایش، نہ دماغ نفیس
 کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ، حیا ذاً باللہ!
 یک قلم خارج آداب و قار و تمکین
 نقشِ لاجول، لکھ، اسے خامہ ہذیاں تحریر!
 یا علی "عرض کر، اسے فطرت و سواس قرین!
 مظہر فیض خدا، جان و دل ختمِ رسل
 قبلہ آلِ نبی، کعبۂ ایجاو یقین
 ہو، وہ سرمایۂ ایجاو، جہاں گرم خرام
 ہر کفِ خاک، ہے واں، گردۂ تصویرِ بریں
 جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا، جس جا
 وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی میں
 نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
 ابد اُپشتِ فلک، خم شدہ نازِ زمیں
 فیضِ خلق اُس کا ہی شال ہے کہ ہوتا ہے سدا
 بوے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگین

بُزْشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا
 قطع ہو جائے نہ سرِ رشتہ ایجا دکہیں
 کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
 رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بختِ پھیں
 جاں پناہ! دل و جاں فیضِ رسانی! شاہ!
 وہی ختمِ رسل تو ہے، بہ فتوایِ یقین
 جسمِ اطہر کو ترے، دوشِ پیمبر، منبر
 نامِ نامی کو ترے، ناصیۂ عرش، نگین
 کس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب؟
 شعلہٴ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
 آستان پر ہے ترے جو ہر آئینہ سنگ
 رقبہٴ بندگی حضرتِ جبریلِ امیں
 تیرے در کے لیے اسبابِ شمارِ آمادہ
 خایکوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
 تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں
 تیری تسلیم کو ہیں، لوح و قلم، دست و جبین

کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوحِ خدا؟

کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں؟

جنسِ بازارِ معاصی، اسد اللہ اسد

کہ ہوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب

ہے ترے حوصلہٴ فضل پر از بس کہ یقین

وے دعا کو مری، وہ مرتبہٴ حسنِ قبول

کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آئیں

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز

کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو الفتِ دلُ دل میں یہ سرگرمی شوق

کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور تجھ سے جبین

دلِ الفتِ نسب و سینہٴ توحیدِ فضا

نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیر

صرف اعدا، اثرِ شعلہٴ دُورِ دوزخ

وقفِ احباب، گل و سنبلِ فردوسِ بریں



ہاں مہر نو! نہیں ہم اُس کا نام
 دودن آیا ہے تو نظر دم صبح
 بارے دودن کہاں رہا غائب؟
 اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
 مرجبا، اے سرورِ خاصِ خواص!
 عُذر میں تین دن نہ آنے کے
 اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
 ایک میں کیا اگر سب نے جان لیا
 باز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
 جانتا ہوں کہ، آج دنیا میں
 میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
 جانتا ہوں کہ، جانتا ہے تو
 مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ
 تجھ کو کیا پایہ رُوشناسی کا
 جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو

جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
 یہی انداز اور یہی اندام
 بندہ عاجز ہے، گردشِ ایام
 آسماں نے بچھا رکھا تھادام
 جبذا اُسے نشاطِ عامِ عوام!
 لے کے آیا ہے عید کا پیغام
 صبح جو جائے اور آئے شام
 تیرا آغاز اور ترا انجام
 مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں تمام؟
 ایک ہی ہے امید گاہِ انام
 غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟
 تب کہا ہے بطرِ استفہام
 قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام
 جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
 پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن ، ماہتاب بن میں کون !
 میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
 ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص
 جو کہ بخششِ گاتجہ کو فخر فروغ
 جب کہ چودہ منازلِ فلکی
 تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر
 دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
 پھر غزل کی روش پر چل نکلا
 مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام
 اور کے لین دین سے کیا کام
 گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
 کیا نہ دیگا مجھے مئےِ گلِ کام
 کر چکے قطع تیری تیزیِ گام
 کوئے دُشکوئے صحنِ منظر و بام
 اپنی صورت کا اک بلوریں جام
 تو سن طبعِ چاہت تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
 مئے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
 بوسہ کیسا یہی نصیبت ہے
 کبھی میں جا، بجائینگے ناقوس
 اُس قدح کا ہے دُور مجھ کو نقد
 بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار
 چھڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
 تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
 غم سے جب ہو گئی ہوزِ ستِ حرام
 کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دُشنام
 اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
 چمخ نے لی ہے جس سے گردشِ ام
 دل کے لینے میں جن کو تھا اِبرام
 کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام؟

کہ چکائیں تو سب کچھ اب تو کہ
 کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
 تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
 قبلہ چشم و دل بہادر شاہ
 شہسوارِ طریقہ انصاف
 جس کا ہر فعل، صورتِ اعجاز
 بزم میں میسر بانِ قیصر و جم
 اے ترالطف، زندگی افزا
 چشم بد دور! خسروانہ مشکوہ
 جاں نثاروں میں تیرے قیصر و جم
 وارث ملک جانتے ہیں تجھے
 زور بازو میں مانتے ہیں تجھے
 مرجا، موشگافی ناوک!
 تیر کو تیرے، تیر غیر، ہدف

ق

رعد کا کر ہی ہے کیا دم بند
 تیرے فیمل گراں جسد کی صدا
 برق کو دے رہا ہے کیا الزام
 تیرے رخس بک غنائ کا خرام

ق

فج صورتگری میں تیرا گرز
اُس کے مضروب کے سروتن سے
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
اور اُن اوراق میں ہر کلمہ قضا
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش
آسمان کو، کہا گیا کہ کہیں
حکم ناطق لکھا گیا کہ، لکھیں
آتش و آب و باد و خاک نے لی
مہرِ رخشاں کا نام، خسرو روز
تیری توقیع سلطنت کو بھی
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
ہے ازل سے رفائی آغاز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
صفحہ ہائے یسالی و ایام
بجملہ مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
گنبد تیز گرد، نیلی فام
خال کو دانہ اور زلف کو دام
وضع سوز و غم و رم و آرام
ماہِ تاباں کا اسم، شمعِ شام
دی بدستور صورتِ ارقام
اُس قسم کو دیا طرازِ دوام
ہو ابد تک رسائی انجام

قصیدہ

مُج دم دروازہ خاورد کھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں
مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا

وہ بھی قہی اک سیما کی سی نمود
 ہیں کو اک کچھ نظر آتے ہیں کچھ
 سطح گردوں پر پڑا تحارات کو
 صبح آیا جانب مشرق نظر
 قہی نظر بندی، کیا جب رُزِ سحر
 لاکے ساتی نے صبحی کے لیے
 بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
 تاجِ زرین، مہر تاباں سے سوا
 شاہِ روشن دل، بہادر شہ کو ہے
 وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
 وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
 پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
 روشناسوں کی جہاں فہرست ہے

صبح کو رازِ بہ و اختِ کھلا
 دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
 موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
 اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا
 بادۂ گلِ رنگ کا ساغر کھلا
 رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
 کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
 خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھلا
 رازِ ہستی اُس پر سترتا سر کھلا
 مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
 عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا
 اُس کے سرِ بنگوں کا جبِ نہر کھلا
 واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

تو سن شہر میں وہ خوبی ہے کُجب
 نقشِ پاکی صورتیں وہ دلفریب
 مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
 تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
 تو کہے، بُخنائے آزر کھلا
 منصبِ مہر و مہر و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے، لیکن ہر لپک
تھا دل وابستہ تفضل بے کلید
باغِ معنی کی دکھاؤ نکلا بہار
ہر جہاں گرم غزل خوانی نفس
میری حد و سب سے باہر کھلا
کس نے کھولا، کب کھلا، کیونکر کھلا؟
مجھ سے گرسٹا، سخن گستر کھلا
لوگ جانیں طبلہ، غنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے؟
ہم کو ہے اس رازداری پر کھنڈ
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کہاں!
مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ!
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک!
مے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
کٹھن میں ہوتا نفس کا در کھلا!
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
زخمِ یکن داغ سے بہتر کھلا
کب کمرے غم کے کی خنجر کھلا!
رہبروی میں پردہ رہبر کھلا
آگ بھڑکی میٹھا اگر دم بھر کھلا
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھو، غالب سے گراُ بھجا کوئی!

ہے دل پوشیدہ، اور کافر کھلا

پھر، ہوا بدست طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامہ سے پانی طبیعت نے مدد
مدح سے مدح کی دیکھی شکوہ
مہر کا نپا، چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
سکتہ مشہ کا ہوا ہے روشناسی
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
نملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے
فکر اچھی، پرستائش ناتمام
جاننا ہوں ہے خط لوح ازل

تم کرو صاحب قرانی، جب تک

ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

مثنوی در صفتِ انبہ

ہاں دل دردمندِ زمزمہ ساز
خامہ کا صفحے پر رواں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھے؟
کیوں نہ کھولے درِ خزینہ راز!
شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
نکتہ ہائے خرد فزا لکھے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
 خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے
 آم کا کون مرد میدان ہے؟
 شمر و شاخ، گوئے چوگاں ہے
 تاک کے جی میں کیوں رہے لڑاں!
 آئے، یہ گوئے اور یہ میدان
 آم کے آگے پیش جائے خاک
 نہ چلا جب کسی طرح مقدر
 پھوڑتا ہے جلے پھچھولے تاک
 یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
 بادۂ ناب بن گیا انگور
 مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے!
 شرم سے پانی پانی ہونا ہے
 نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
 آم کے آگے میٹر کیا ہے
 اور دوڑائیے قیاس کہاں!
 جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
 جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں!
 کو کہن باوجود غم گین
 جان دینے میں اس کو کیا جان
 پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
 نظر آتا ہے یوں مجھے یہ شمر
 کہ دو احسانہ ازل میں مگر
 آتش گل پہ قند کا ہے قوام
 شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
 یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
 باغبانوں نے باغِ جنت سے
 انگبیں کے مجسم رب الناس
 بھر کے بھیجے ہیں سرمہ ہر گلاس
 یا لگا کر خضر نے سناخ نبات
 مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے شرفِ شاں یہ نخل
 تھا ترنجِ زر ایک خسر و پاس
 آم کو دیکھتا، اگر اک بار
 رونقِ کار گاہِ برگ و نوا
 رہد راہِ حُسد کا توشہ
 صاحبِ شاخِ برگِ بار ہے آم
 خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
 وہ کہ ہے والی ولایتِ عہد
 فخر دیں عزتِ شان و جاہِ جلال
 کار فرمائے دین و دولت و بخت
 سایہ اُس کا، ہنما کا سایہ ہے
 اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور
 اِس خداوندِ بندہ پرور کو
 ہم کہاں ورنہ، اور کہاں یہ نخل
 رنگ کا زرد، پر کہاں بُوباس
 پھینک دیتا طلبے دستِ افشار
 نازشیں دو دمانِ آب و ہوا
 طوبی دسدرہ کا جگر گوشہ
 ناز پروردہ بہار ہے، آم
 نورِ نخلِ بارِغِ سلطان ہو
 عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد
 زینتِ طینت و جمالِ کمال
 چہرہ آرا سے تاج و مسند و تخت
 خلق پر وہ حُسد کا سایہ ہے
 جب تک ہے نمودِ سایہ و نور
 وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شاد ماں رکھو
 اور غالب پہ مہرباں رکھو





قَطْعٌ



اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر!
 اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل!
 پاتو سے تیرے لئے فرقِ ارادت اور نگ
 فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکیل
 تیرا اندازِ سخن، شانہ زلفِ اہام
 تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل
 تجھ سے عالم پہ کھلا، رابطہٴ قربِ کلیم
 تجھ سے دنیا میں بچھا ماندہٴ بذلِ خلیل
 سخن، اوجِ درجہٴ مرتبہٴ معنی و لفظ
 بہ کرم داغِ نہِ ناصیہٴ قلم و نیل
 تاترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
 تاترے عہد میں ہو رنج و ألم کی تقلیل
 ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
 زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
 تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہن
 تیری بخشش، مری انجراحِ مفاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترقم، مرے جینے کی نوید
 تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دیں
 بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
 چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
 پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتہ، اوقات میں گانٹھ
 پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
 تپشِ دل، نہیں ہے رابطہ، خوفِ عظیم
 کششِ دم، نہیں ہے ضابطہ، جزِ ثقیل
 دُورِ معنی سے مرا صفحہ، لغتِ کی دارِ اُسی
 غمِ گیتی سے مرا سینہ، عمر کی زمبیل
 فکرِ میری، گہراں دوزِ اشاراتِ کثیر
 کلکِ میری، رستمِ آموزِ عباراتِ قلیل
 میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدقِ توضیح
 میرے اجمال سے کرتی ہے تراوشِ تفصیل
 نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
 جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل

قبلہ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر!
 کعبہ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل!
 قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
 کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
 بس اب بگڑے یہ کیا شرمندگی، جانے دو، بل جاؤ
 قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں، کیوں ہم نہ کہتے تھے؟
 قطعہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
 اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہاے ہاے!
 وہ سبزہ زار ہاے مطر آ کر ہے غضب
 وہ نازیں بُتانِ خود آرا کہ ہاے ہاے
 صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ خفِ نظر!
 طاقت رُبا وہ اُن کا اشار کہ ہاے ہاے
 وہ میوہ ہاے تازہ شیریں کہ واہ واہ
 وہ بادہ ہاے نابِ گوارا کہ ہاے ہاے!

درمدحِ ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پر یہ چکنی ڈلی
 زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے
 خام انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے !
 ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے !
 مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
 جزبہ بازوئے شکر فانی خود آرا کہیے
 مستی آلودہ سر انگشتِ حسناں لکھیے
 داغِ طرفِ جگر عاشقِ شیدا کہیے
 خاتمِ دستِ سیماں کے مشابہ لکھیے
 سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
 اخترِ سوختہ اقیس سے نسبت دیجیے
 خالِ مشکینِ رُخ و لکشرِ لہلا کہیے
 حجرِ الاسودِ دیوارِ حُرمِ محبہ فرض
 نافہ آہوئے بیابانِ حقن کا کہیے
 وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
 رنگ میں سبزۂ نوخیزِ میحا کہیے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر ٹھہرنا ساز
 میکدے میں اسے خشتِ خم صہبا کیے
 کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟
 کیوں اسے نقطہٴ پرکار تمنا کیے؟
 کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے؟
 کیوں اسے مرؤمِ دیدہٴ عنقا کیے؟
 کیوں اسے نمونہٴ پیراہنِ لایلا لکھیے؟
 کیوں اسے نقشِ پے نازِ سلا کیے
 بندہ پروردگار کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
 اور اس چکنی سُپاری کو سُویدا کیے
 قطعہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضور والا نے
 مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
 نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
 جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

بیانِ مصنف

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
 اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
 سوچت سے ہے پیشہ آبِ سہ گری
 کچھ شاعری، ذریعہ عزت نہیں مجھے
 آزادہ رو ہوں، اور ہر اسلک ہے صلحِ کل
 ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
 کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
 مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
 استادِ شبہ سے ہو مجھے پرغاش کا خیال
 یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
 جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
 سو گند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
 میں کون، اور رنجت، ہاں اس سے مدعا
 بجز انبساطِ خاطر حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہ استنابِ امر
 دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
 مقطع میں آپڑی ہے، سخن گسترانہ بات
 مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
 رُوئے سخن کسی کی طرف ہو، تو رُو سیاہ
 سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
 قسمت بُری سہی، یہ طبیعت بُری نہیں
 ہے شکر کی جگہ، شکایت نہیں مجھے
 صادق ہوں اپنے قول میں غالبِ خدا گواہ
 کہتا ہوں سچ کہ، جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح

نصرتُ الملک بہادر اے مجھے بتلا کہ مجھے
 تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے؟
 گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
 رونقِ بزمِ مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ، گرجی میں کبھی غور کروں
 غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
 خشکی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست
 نسبت اک گونہ مرے دل کو تھے ہات سے ہے
 ہاتھ میں تیرے رہے تو سن دولت کی عناس!
 یہ دُعا شام و سحر و امنی حاجات سے ہے
 تو مسکن رہے، مرا فخر ہے بس تیرا
 گو شرفِ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
 اس پہ گزرے نہ گساں ریلو دریا کا زہنا
 غالبِ خاک نشیں، اہلِ خرابات سے ہے



ہے چارِ شنبہ آخر ماہِ صَفَر، چلو
 رکھ دیں حُسن میں بھر کے مے مُشکِ بو کی ناند
 جو آئے، جامِ بھر کے پیے اور ہو کے مست
 سبزے کو روندنا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند

غالب! یہ کیا بیاں ہے، بجز مدح بادشاہ
 بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند
 بٹے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
 ہے جن کے آگے سیم وزر مہر و ماہ ماند
 یوں سمجھیے کہ بیچ سے حوالی کیے ہوئے
 لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

در مدح شاہ

اے شاہ جہاں گیر جہاں بخش جہاندار!
 ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
 جو عتدہ دُشوار کہ کو بخشش سے نہ وا ہو
 تو واکرے اُس عقدے کو سو بھی بہ اشارت
 ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر!
 گرب کو نہ دے چشمر، حیواں سے طہارت
 آصف کو سلیمان کی وزارت سے شرف تھا
 ہے فخر سلیمان جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مُریدی ترا، مسرمانِ الہی
 ہے داغِ عثمانی ترا، توقیعِ امارت
 تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
 تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
 ڈھونڈھے نہ ملے موجِ دریا میں روانی
 باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
 ہے گرچہ مجھے نکستہ سرانی میں تو غل
 ہے گرچہ مجھے سحرِ طرازی میں بہارت
 کیونکہ نہ کروں مدح کو میں خستہ دُعا پر
 قاصر ہے ستائش میں تری، میری عبارت
 نورِ روز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
 نظرِ ارگی صنعتِ حق اہل بصارت
 تجھ کو شرفِ مہرِ جہان تابِ مبارک
 غالب کو ترے عتبہِ عالی کی زیارت

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ، اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے، کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے
گزارشِ مصنف بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ! ۞ اے جہاندارِ آفتابِ آمار!
تھامیں اک بے نوائے گوشتِ نیش تھامیں اک درِ مندِ سیدِ نگار
تم نے مجھ کو جو آبر و بخشش ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرہ ناچیز روشناسِ ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گرا اپنے کو میں کہوں خاکی جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہوں بادشہ کا سلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر نسبتیں ہو گئیں مستحقِ چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
 پیرو مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں
 کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
 کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
 کچھ خرید انہیں ہے اب کے سال
 رات کو آگ اور دن کو دھوپ
 آگ تارے کہاں تلک انساں!
 دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
 میری تنخواہ جو مقرر ہے
 رم ہے مرنے کی چھا ہی ایک
 مجھ کو دکھو تو ہوں بقید حیات
 بس کر لیتا ہوں ہر مہینے قرض
 میری تنخواہ میں تہائی کا
 آج مجھ سا نہیں زمانے میں
 رزم کی داستان گرسنے
 بزم کا استراام گریجے

مدعاے ضروری الاظہار
 ذوق آرایش سرودستار
 تانہ دے بادز مہر آزار
 جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
 کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
 بھاڑ میں جائیں ایسے یل و نہار!
 دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار!
 وَقَيْنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ
 اُس کے طے کلمے عجب ہنزار
 خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
 اور چھپا ہی ہو سال میں دوبار
 اور رہتی ہے سود کی تبحر
 ہو گیا ہے شریک سا ہو کار
 شاعر نغز گو سے خوش گفتار
 ہے زباں میری تیغ جو ہر وار
 ہے قلم میری، ابر گو ہر بار

ظلم ہے، گرنہ دُسخن کی داد قہر ہے، اگر گرد نہ مجھ کو پیار
 آپ کا بندہ اور پھروں نہنگا! آپ کا تو کرا اور کھاؤں اُدھار!
 میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ تانا ہو مجھ کو زندگی دُشوار
 ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام شاعری سے نہیں مجھے سُرکار
 تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں ن پچاس ہزار



سیہِ گلیم ہوں، لازم ہے میرا نام ملے
 جہاں میں جو کوئی فسح و ظفر کا طالب ہے
 ہوا نہ غلبہ میرے کبھی کسی پہ مجھے
 کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے



سہل تھا سہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی
 مجھ پہ کیا گزریگی اتنے روزِ حاضرین ہوئے
 تین دن سہل سے پہلے، تین دن سہل کے بعد
 تین سہل، تین تبریدیں، یہ سب کئے دن ہوئے؟

☆
 فحشۂ انجمن طوے میرزا جعفر
 کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محفوظ
 ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب !
 نہ کیوں ہو مادہ سال عیسوی "محفوظ"
 ۱۸۵۴ء

☆
 ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
 ہوا بزم طرب میں رقصِ ناہید
 کہا غالب سے "آئیج" اس کی کیا ہے ؟
 تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"
 ۱۲۶۰ھ

☆
 گو ایک بادشاہ کے سب حنا زاد ہیں
 دربارِ دارِ لوگ بہم آشنا نہیں
 کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
 اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں





بعد از اتمام بزم عید اطفال
ایام جوانی رہے ساغرِ کُشِ حال
آپہنچے ہیں تا سواہِ استیلمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ! یک قدم استقبال



شب زلف و رُخ عرقِ فشاں کا غم تھا
کیا شرحِ کردوں کہ طُرفِ تر عالم تھا
رویائیں ہزار آنکھ سے صبحِ تلک
ہر قطرہ اشک، دیدہ پُر نم تھا



آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اُسی طور کا حال
تھا موجبِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لیے گیا ہے کیسا کھیل نکال!



دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہیدِ ہی
 بیستابیِ رشک و حسرتِ دیدِ ہی
 ہم اور نسرِ دن، اے تجلی، افسوس!
 تکرارِ روا نہیں، تو تجدیدِ ہی



ہے خلقِ حسدِ قماشِ لڑنے کے لیے
 وحشتِ کدۂ تلاشِ لڑنے کے لیے
 یعنی، ہر بار صورتِ کاغذِ باد
 ملتے ہیں یہ بد معاشِ لڑنے کے لیے



دل سخت زخمِ ہو گیا ہے گویا
 اُس سے گلِ مسند ہو گیا ہے گویا
 پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
 غالب! مَنہ بند ہو گیا ہے گویا

☆
 دکھ، جی کے پسند ہو گیا ہے غالب!
 دل رُک رُک کے بند ہو گیا ہے غالب!
 اللہ کے شب کو نیند آتی ہی نہیں
 سونا سو گند ہو گیا ہے غالب!

☆
 مشکل ہے زبسن کلام میرا اے دل!
 سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
 آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
 گویم مشکل، وگر نہ گویم مشکل!

☆
 بیبھی ہے جو مجھ کو شاہِ حجابہ نے، دال
 ہے نطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
 یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
 ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال



ہیں شبہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم؛
ہے اب کے شبہِ قدر و دوالی باہم



حق، شبہ کی بقا ہے، خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوع دانش داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے



اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا!
اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا!
ہر سینکڑے کو ایک گرہ منرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا!



کہتے ہیں کہ، اب وہ مردم آزار نہیں
عُشاق کی پُرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں



ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں، کہیں خدا سے، اللہ اللہ!
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے



سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایساں ہے، غالب! لیکن
خسناۃ و برناب کہاں سے لاؤں!



ان سیم کے بچوں کو کوئی کیا جانے !
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہر والا نے
گن کر دیوینگے ہم دُعا ئیں سو بار
غیر دزے کی تسبیح کے ، ہیں یہ دانے



ضمیمہ

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
 وضع میں گو ہوئی دوسرا تیغ ہے ذوالفقار ایک
 ہم سخن اور ہم زباں، حضرت قاسم و طیب
 ایک تلاش کا جانشین، درد کا یادگار ایک
 نعتِ سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی
 شعر کے فن کے واسطے، مایہ اعتبار ایک
 ایک وصال و مہر میں، تازگیِ بساطِ دہر
 لطف و کرم کے باب میں ازینتِ روزگار ایک

لے اس سے ابوالعلا قاسم خاں قاسم مراد ہیں۔

۲ مرزا احمد بیگ طیب مراد ہیں۔

ان دونوں سے کلکتہ کے سفر کے دوران میں ملاقات ہوئی تھی۔

ٹھکدہ تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بُو
 رنجتہ کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک
 مملکت کمال میں، ایک ایسے نامور
 عرصہ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک
 گلشنِ اتفاق میں، ایک بہار بے خزاں
 مے کدہ وفاق میں، بادہ بے خمار ایک
 زندہ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
 کشتہ ذوقِ شعر کو، شمعِ سحر مزار ایک
 دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسولِ پر خدا
 ایک محبت چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک
 جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نو بہار
 فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک
 لایا ہے کہہ کے یہ غزل، شائبہِ ریاسے دور
 کر کے دل و زبان کو غالبِ خاکسار ایک

اپنا احوالِ دل زار ، کہوں یا نہ کہوں ؟
 ہے جیسا مانعِ اظہار ، کہوں یا نہ کہوں ؟
 نہیں کرنے کا میں تقصیر ، ادب سے باہر
 میں بھی ہوں واقفِ اسرار ، کہوں یا نہ کہوں !
 شکوہ سمجھو اسے ، یا کوئی شکایت سمجھو
 اپنی ہستی سے ہوں بیزار ، کہوں یا نہ کہوں !
 اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتار می دل
 جب نہ پاؤں کوئی عنخوار ، کہوں یا نہ کہوں ؟
 دل کے ہاتھوں سے ، کہے دشمن جانی اپنا
 ہوں اک آفت میں گرفتار ، کہوں یا نہ کہوں ؟
 میں تو دیوانہ ہوں ، اور ایک جہاں ہے غماز
 گوش ہیں در پس دیوار ، کہوں یا نہ کہوں ؟
 آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے ، تو اسید !
 حسبِ حال اپنے پھر اشعار ، کہوں یا نہ کہوں ؟

لے مخم ، لے شکر جو سمجھو اسے یا کوئی روایت سمجھو لے عرادی ، لے میرا ۔

شہ گلدستہ نازیناں ، ص ۳۱۳ : دیوان معروف ۱۹۱-۱۹۲ (مثنیٰ دیوان معروف) سے

لیا گیا ہے اور اختلافات گلدستہ نازیناں "مؤلف مولوی کریم الدین (مطبوعہ ۱۸۴۵ء) پر مبنی ہیں۔



ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
 میں دشتِ غم میں، آہوے صیتا دیدہ ہوں
 ہوں درد مند، جبر ہو یا اختیار ہو
 گر مالہ کشیدہ، گر اشک چکیدہ ہوں
 جاں بے آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
 از بسکہ، تلخیِ عنہم حیراں چشیدہ ہوں
 نے سُبح سے عداقت، نہ ساغر سے رابطہ
 میں معرضِ مشال میں، دست بُریدہ ہوں
 ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
 نہ پلے دانہ فتادہ ہوں، نہ دام چیدہ ہوں
 جو چاہے، نہیں وہ مری سدر و منزلت
 میں یوسفِ بقیعتِ اذل حسریدہ ہوں
 ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
 ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں

لے واسطہ لے نے لے چاہتے۔

اہل ورع کے حلقے میں ہرچند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقہ میں، میں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد!
ڈرتا ہوں آئینے سے، کہ مردُم گزیدہ ہوں



بجاس شمع عذراں میں جو آجاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامن صبا جاتا ہوں
ہو دے ہے جادہ زہ، رشتہ رگو ہر ہر گام
جس گزر گاہ میں، میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبک رو کے نہ رہنے سے رہو
کہ بیک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں



شبِ سال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
خارج بادشہیں، کیوں مانگوں آج!
ہوا ہے موجب آرام جان دن تکیہ
کہ بن گیا ہے خم جسد پر شکن تکیہ
بنائے تختہ نگل ہاے یاسیں بستر
ہوا ہے دستہ نسرین و نسرین تکیہ

لہ حلقے تہ زمرے تہ آئینہ -

تہ بیاض نواب علاء الدین احمد خاں علانی (قلمی) ہر رضا لائبریری (پسرور) تہ عمدہ منتخب (قلمی) ۹۲

فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
 مزا اٹھے، کہو کیا خاک، نہاتھ سونے کا
 اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر
 ہوا ہے کاٹ کے چادر کو نگاہاں غائب
 بضرِ بیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
 یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہوتے تک
 اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے، لیکن
 غش آگیا جو پس از قتل میرے قابل کو
 شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
 روار کھونہ رکھو تھا جو لفظ ”تکیہ کلام“
 جو خستِ خواب ہے پروں تو ہے پر تن تکیہ
 رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیم تن تکیہ
 اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ
 اگرچہ زانو سے نل پر رکھے دمن تکیہ
 کہ ضربِ بیشہ پہ رکھتا تھا، کوہکن تکیہ
 رکھونہ شمع پر اے اہل انجمن تکیہ
 اٹھائے کیونکہ یہ رنجِ خستہ تن تکیہ
 ہوئی ہے اُس کو مری نقشبے کفن تکیہ
 کہ سانپ فرس ہے اور سانپ کاٹے تن تکیہ
 اب اس کو کہتے ہیں اہل سخن، سخن تکیہ

ہم اور تم، فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
 فقیرِ غالب مسکین کا ہے کہنِ یکیشہ



میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جھٹا اور سہی
 تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

لے ہونے لے رکھونہ شمع کے اوپر، اے انجمن! تکیہ

غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ !
 ہیں ہوسِ پیشہ بہت ، وہ نہ ہوا، اور ہسی
 تم ہو بُت ، پھر تمہیں پسندِ خدائی کیوں ہے ؟
 تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور ہسی
 حُسن میں خور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
 آپ کا شیوہ و انداز و ادا، اور ہسی
 تیرے کوچے کا ہے مائلِ دلِ مضطر میرا
 کعبہ اک اور ہسی ، قبلہ نما اور ہسی
 کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ !
 خلد بھی باغ ہے، خیر آب دہوا اور ہسی
 کیوں نہ فر دوس میں دوزخ کو بلا لیں، یارب !
 سیر کے واسطے تھوڑی سی فصا اور ہسی
 مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
 زہرِ کچھ اور ہسی ، آبِ بہتا اور ہسی
 مجھ سے ، غالب ! یہ علانی نے غزلِ کھوانی
 ایک بیداد گرِ رنجِ فنزا اور ہسی

لے کوچے سے اردو سے مقلی ۲۸۷



کئے تو شب کہیں، کانٹے تو سانپ کہلاوے
 کوئی بتاؤ، کہ وہ زلفِ خمِ بخت کیا ہے
 لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
 کسے خبر ہے کہ، وہاں جنبشِ قلم کیا ہے؟
 نہ حشر و نشر کا قابلِ نہ کیش و ملت کا
 خدا کے واسطے! ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟
 وہ داد و دید گرا نمایہ شرط ہے، ہم
 وگرنہ مہرِ سیماں و جسامِ جم کیا ہے؟



آپ نے مَسْنِی الصُّرِّ، کہا ہے تو یہی
 یہ بھی یا حضرتِ ایوبؑ! گلا ہے تو یہی

لہ اس غزل کے تین شعر پہلے گزر چکے ہیں (۲۱۶) یہ تینوں شعر اردو سے نقل کیے گئے ہیں (۲۹۱) نیز دیکھیے خطوطِ غالب (۱) : ۳۶۸ - ۳۶۹ طے اے

رنجِ طاقت سے ہوا ہو، تو نہ پیٹوں کیوں سڑ
 ذہن میں، خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی
 ہے غنیمت، کہ بائیس گزر جائیگی عمر
 نہ لے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی
 دوست گرتے کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری
 نہ سہی، ایک تمنا سے دوا ہے تو سہی
 غیر سے، دیکھیے، کیا خوب نبھائی اُس نے!
 نہ سہی ہم سے، پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی
 نقل کرتا ہوں اُسے نامہ اعمال میں، میں
 کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
 کبھی آجائیں گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالب!
 شہرہ تیسری شمشیرِ قصا ہے تو سہی



لطفِ نظارۂ قاتل، دمِ بسل آئے
 جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے

لے تو بیڑوں کیونکر، تو نہ پیٹوں کیونکر، لے لی، لے ہی، لے ایک۔ ۲۷۳

اُن کو کیا عِلم کہ کشتی پہ مری کیا گزری !
 دوست جو ساتھ مرے نائب ساحل آئے
 وہ نہیں ہم، کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ !
 ساتھ حجاج کے اکشر کئی منزل آئے
 آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پُکار اُٹھتے ہیں
 لو، وہ برہم زن ہنگامہ محفل آئے^۱
 دیدہ خونبار ہے مدت سے، ولے آج ندیم !
 دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے
 سامنا خور و پری نے، نہ کیا ہے، نہ کریں
 عکس تیرا ہی مگر، تیرے مقابل آئے
 اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا، غالب !
 آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے^۲

۱۔ آج کل (دہلی) ۱۵ جون ۱۹۴۳ء

۲۔ دیوانِ غالب (مرتبہ حسرت) ۲ : ۱۷۵

☆
 دیکھ وہ برقی تبسم بسکے دل بیتاب ہے
 دیدہ گریاں مرا، فوارۂ سیلاب ہے
 کھول کر دروازۂ میخانہ، بولا مے فروش
 ”اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتحِ الباب ہے“ لے

☆
 ایک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے
 رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر، ہم جس گھر جلے
 پر دانہ کا نہ عنسم ہو، تو پھر کس لیے، اسدا!
 ہر رات شمعِ شام سے لے تا سحر جلے لے

☆
 ذرا کر زور سینے پر، کہ تیرا تبسم نکلے
 جو وہ نکلے، تو دل نکلے، جو دل نکلے تو دم نکلے

خمسہ بر غزل بہادر شاہ ظفر

گتے گتے پانویں زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر، قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا، کاش! کیوں تکیر آدھی رہ گئی
”کھینچ کے، قاتل! جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے، جانِ عاشقِ دلگیر، آدھی رہ گئی“

بیٹھ رہتا، لے کے چشمِ پرِ غم، اُس کے رُو برو
کیوں کہا تو نے کہ، دل کا غم اُس کے رُو برو
بات کرنے میں، نکلتا ہے دم، اُس کے رُو برو
”کہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے رُو برو
ہم نشیں! آدھی ہوئی، تفسیرِ آدھی رہ گئی“

تو نے دیکھا، مجھ پہ کیسی بن گئی، اے رازدار!
 خواب و بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار!
 مثل زخم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہو شیار
 ”کھینچتا تھا، رات کو، میں خواب میں تصویرِ یار
 جاگ اٹھا، جو کھینچنی تصویرِ آدمی رہ گئی“

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں اے دلنواز!
 مستی چشمِ سیہ سے چل سکے ہو دیں چارہ ساز
 تو صدا سے پاسے جاگا تھا جو، بخوابِ ناز!
 ”دیکھتے ہی، اے ستمگر! تیری چشمِ نیم باز
 کی تھی پوری ہم نے جو تدبیرِ آدمی رہ گئی“

اُس بُتِ مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات!
 جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک اذنا ہے بات
 ماہِ نو نکلے یہ گزری ہوئی راتیں پان سات
 ”اُس رُخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات
 تابشِ خورشید پر تنویرِ آدمی رہ گئی“ ۲

تاجھے پہنچائے کا ہش، بخت بد ہے گھات میں
 ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں
 جز غم ورنج و اَلَم، گھاٹا ہے ہر ایک بات میں
 ”کم نصیبی اس کو کہتے ہیں، کہ میرے ہات میں
 آتے ہی، خاصیتِ اکسیر آدھی رہ گئی“

سب سے یہ گوشہ کنا ہے، گلے لگ جاوے
 آدمی کو کیٹش پکا ہے، گلے لگ جاوے
 سر سے گر جا در اُتا ہے، گلے لگ جاوے
 ”مانگ کیا بیٹھا سنا ہے، گلے لگ جاوے
 وصل کی شب، اسے بُت بے پیر آدھی رہ گئی“

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے
 پر نصیب اپنا، انھیں جاتا سنا، جوں پھر گئے
 دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
 ”آکے آدھی دور میرے گھر سے، وہ کیوں پھر گئے؟
 کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی؟“

ناگہاں یاد آگئی ہے مجھ کو یارب! کب کی بات
 کچھ نہیں کہتا کسی سے سُن رہا ہوں سب کی بات
 کس لیے تجھ سے چھپاؤں ہاں وہ برسوں شب کی بات!
 ”نار برجلدی میں تیری، وہ جو تھی مطلب کی بات
 خط میں آدھی ہو، سکی تحریر، آدھی رہ گئی“

ہو تجسلی برق کی صورت میں ہے یہ بھی غضب
 ہاں چھ گھنٹے کی تو ہوتی، فرصت عیش و طرب
 شام سے آتے، تو کیسا اچھی گزرتی رات سب
 ”پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب
 بھلی آدھی حسرت، اسے تقدیر! آدھی رہ گئی“

تم جو فرماتے ہو، دیکھ، اسے غالب آشفۃ سر!
 ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے، گیا کیوں اُس کے گھر؟
 جان کی پاؤں اماں باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
 ”دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفرِ
 وہاں کے جانے میں مری تو قیر آدھی رہ گئی“

لہ دہلی اردو اخبار بحوالہ علی گڑھ یسٹرن (غالب نمبر): ۱۰۱-۱۰۲ -

قصیدہ

ملاذ کشور و لشکر، پناہ شہر و سپاہ
 جناب عالی ایلن برون والاجاہ
 بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر
 کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرف نگاہ
 وہ محض رحمت و رافت، کہ بہر اہل جہاں
 نیا بستہ دم عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
 وہ عین عدل، کہ دہشت سے جس کی پریش کی
 بنے ہے، شعلہ آتش، انیس پڑے کاہ
 زمیں سے سودہ گوہر اٹھے، بجائے غبار
 جہاں ہو، تو سن حشمت کا اُس کے جولا نگاہ
 وہ مہرباں ہو تو انجسم کہیں: "اہلی ہشکر"
 وہ فضلیں ہو، تو گردوں کہے: "خدا کی پناہ"

ق

یہ اُس کے عدل سے، اضداد کو ہے آمیزش
 کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہ ہر سہ راہ
 ہنر بر، پنچے سے، لیتا ہے کام شانے کا
 کبھی جو ہوتی ہے اُنھی ہوتی دُمِ روباہ
 نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
 نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسراہ
 خدا نے اُس کو دیا ایک خوب و فرزند
 ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوے ماہ
 زہے، ستارۂ روشن، کہ جو اُسے دیکھے
 شعاع مہر درخشاں ہو اُس کا تار نگاہ
 خدا سے ہے یہ توقع، کہ عہدِ طفل میں
 بینکا مشرق سے تا مغرب اس کا بازیگاہ
 جو ان ہو کے کریگا یہ وہ جہاں نبانی
 کہ تابع اس کے ہوں رفد و شب سپید و سیاہ
 کیگی خلق اُسے "داورِ سپہر شکوہ"
 لکھینگے لوگ اُسے "خردِ ستارہ سپاہ"

عطا کریگا خداوندِ کارِ سازِ اسے
 روانِ روشن و خوش و دلِ آگاہ
 ملیگی اس کو وہ عقلِ ہفتہ داں، کہ اسے
 پڑے نہ قطعِ خصوصت میں، احتیاجِ گواہ
 یہ ترکِ تازے برہم کرے گا کشورِ روس
 یہ لیگا، بادِ شہِ چیں سے، چھینِ تخت و کلاہ
 سینِ عیسوی، اٹھارہ سو اور اٹھاون
 یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و بگاہ
 یہ جتنے سینکڑے ہیں سب ہزار ہو جاویں
 دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ
 اُمیدوارِ عنایات، ”شیونارائن“
 کہ آپ کا ہے نہکِ خوار اور دولت خواہ
 یہ چاہتا ہے کہ دُنیا میں عز و جاہ کے ساتھ
 تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ!

قصیدہ

گنی ہیں سال کے رشتے میں ہیں بارگرہ
گرہ کی ہے یہی گنتی، کہ تار روز شمار
یقین جان، برس گانٹھ کا ہے جو ماگا
گرہ سے اور گرہ کی اُسید کیوں پڑے!
دکھا کے رشتہ کسی جوشی سے بچتا تھا
کہا، کہ چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نوگرہیں
خود آسمان ہے ہمارا اور اجا پر صیغے
وہ راؤ راج بہادر، کہ حکم سے جن کے
انہیں کی سالگرہ کے لیے ہے سال سال
انہیں کی سالگرہ کے لیے بناتا ہے
انہیں کی سالگرہ کے لیے ہے یہ توقیر
سُن لئے یہ ہم برس گانٹھ کے یہ تانگے نے
پے دُعا ہے بقا سے جناب فیض آب
ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی

ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ
ہوا اگر گی ہر اک سال پیش کار گرہ
یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں ہیشا گرہ
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں، تین چار گرہ
کہ دیکھ کتنی اٹھ لائی گنا یہ تار گرہ؟
جواں گنٹے تو پاویں گے نو ہزار گرہ
کر گیا سینکڑوں، اس تار پر ہزار گرہ
رواں ہوتا رہ فی الفور دانہ وار گرہ
کہ لائے غیب سے غنوں کی نو ہزار گرہ
ہوایں بوند کو، ابتر ہو گئے بار گرہ
کہ بن گئے ہیں ثمر ہائے شاخا گرہ
تھے بتاؤں، کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ
لیگیں اس میں ثوابت کی استوار گرہ
بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ

عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اُس کو
 کشادہ رخ نہ پھرے کیوں جب اُس نے نہیں
 متاعِ عیش کا ہے قافلہ چلا آتا
 خدا نے دی ہے وہ غالب کو دستِ سخن
 کہاں مجالِ سخن، سانس لے نہیں سکتا
 گرہ کا نام لیا، پُر نہ کر سکا کچھ بات
 کھلے یہ گانٹھ تو البتہ دم بھل جاوے
 ادھر نہ ہوگی توجہ حضور کی جت تک
 دعا ہے یہ کہ مخالف کے دل میں ازرہ نہ ٹھنسن
 پڑی ہے یہ جو بہت سخت ناکارگرہ

دل اُس کا پھوڑ کے بچلے، بشکل پھوڑے کی
 خدا کرے کہ کرے اس طرح ابھارگرہ

قصیدہ

کرتا ہے چرخ روزِ بصد گونہ احترام
 حق کو حق پرست و حق اندیش حق شناس
 فرماں روا کے کشورِ پنجاب کو سلام
 ثوابِ مستطاب، امیرِ شہِ احتشام
 ترکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حُسام
 جمِ رتبہ میکاوڑ بہادر کہ وقتِ رزم

جس بزم میں کہ ہوا نہیں آئینِ میکشی
چاہا تھا میں نے تم کو مہ چارہ کہوں
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
سچ ہے، تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
میری سنو، کہ آج تم اس سرزمین پر
انبارِ لودھیا نہ میں، میری نظر ٹری
ٹکڑے ہو اب دیکھ کے تحریر کو جگر
وہ فرد، جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ ایک قلم
شربِ برس کی عمر میں یہ داغ جاگداز
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
اُس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
سمجھا اُسے گراب، ہوا پاش پاش دل
عزت پُراہل نام کی ہستی کی ہے پنا

واں آسان شیشہ بنے، آفتاب جام
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیال غام
حضرت کا عجز و جاہ رہ گیا علی الدوام
دریائے نور ہے فلک اب گیسے قدام
حق کے تفضلات سے جو مرجعِ انام
تحریر ایک جس سے ہوا بند، تلخ کام
کاتب کی آتیں نے گزرتی بے نیام
جب یاد آگئی ہے، کیسے جایا ہے تمام
لمبرِ رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
جس نے جلا کے رکھ مجھے کروا تمام
استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
لمبرِ ملا نشست میں از رو سے اہتمام
دربار میں جو مجھ پر علی پشکب عوام
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
 آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
 اس کش مکش میں آپ کا مداح درد مند
 جواں نہ کہتے تھا، وہ لکھا حضور کو
 ٹھک دسپ نہ ہو تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں
 وگنہ کا دہر میں جو مدح خوان ہو
 خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو مندر
 امجدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
 ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو
 دستورِ فنِ شمر ہی ہے قدیم سے

ہے یہ دعا، کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے
 اقلیم ہند و ہند سے تا ملکِ روم و شام



لے ازدحام ۵ نامور ۳ کر

۵ سندھ ۵ اہلال ، ۱۴ جون ۱۹۱۳ء ۲۸۶

قصیدہ

مرجبا! سالِ فرخی آئیں عیدِ شوال و ماہِ فردر دیں
 شبِ دروز، افتخارِ لیل و نہار مردِ سال، اشرفِ شہور و سنیں
 گرچہ ہے بعدِ عید کے نوروز لیکن شیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
 سو، اس آئیں دن میں ہولی کی جابجا مجلسیں ہوتی رنگیں
 شہر میں کو بجو، عبیر و گلآل باغ میں سوسو، گل و نمبریں
 شہر، گویا، نمونہ، گلزار باغ، گویا، نگارِ حنا و چین
 تین تیو ہار، اور ایسے خوب جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں
 پھر ہوتی ہے اسی مہینے میں منعقد، محفلِ نشاطِ قہر میں
 محفلِ غسلِ صحتِ نواب رونقِ اسزائے مسندِ تکیں
 بزمِ گہ میں، امیرِ شاہِ نشاں رزگرمیں، حریفِ شیرِ کیں
 پیشگاہِ حضورِ شوکت و جاہ خیر خواہِ جناب، دولت و دیں
 جن کی مسند کا آساں گوشہ جن کی محاسن کا آفتابِ رنگیں

لے پیش کار -

لے ملیں -

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے
 دہریں اس طرح کی بزمِ سرور
 انجمنِ چرخ، گوہرِ آگینِ فرش
 راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے
 وہ نظرِ گاہِ اہل وہمِ خیال
 واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم !
 یاں زمین پر نظرِ جہاں تک جائے
 نقشِ مطربانِ زہرہ نوا
 اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون
 سرورِ مہرِ سر ہو ا جو سوار
 سب نے جانا، کہ ہے پری توں
 نقشِ ستمِ سمند سے، بحیر
 فوج کی گردِ راہ، مُشکِ فشاں
 بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت
 مَوَپِ خاص یوں زمین پر تھا
 آسماں ہے گداے سایہ نشیں
 نہ ہوئی ہو کبھی بروے زمیں
 نورِ مے، ماہِ ساغرِ سیہیں
 ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
 یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں
 کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
 ژالہ آسا بچھے ہیں دُورِ نہیں
 جسلوۂ کولیٰ ان ماہِ جہیں
 یاں وہ دیکھا بچشمِ صورتِ ہیں
 بکمالِ تجسُّل و تزیین
 اور بالِ پری ہے دامنِ نہیں
 بن گیا دشت، دامنِ گلچیں
 رہڑوؤں کے مشامِ عطرِ آگین
 فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
 جس طرح ہے سپہرِ پرویں

ق

چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام
اور داغ آپ کی غلامی کا
بندہ پرور! شاطر ازی سے
آپ کی مدح، اور میرا مُتھ!
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
دستِ خالی و خاطرِ غمگین
ہے تسلیم کی لہ جو سجدہ ریز زمین
غالبِ عاجزِ نیاز آگین

ہے دُعا بھی یہی، کہ دنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں! آمین! لے



لے کو لے کمال (دہلی) جنوری ۱۹۱۰ء

مثنوی

ایک دن، مثلِ پتنگ کاغذی
خود بخود کچھ ہم سے کُنیانے لگا
میں کہا: اے دل! ہواے دلبراں
”بیچ میں اُن کے زانا زنیہار“
”گورے پنڈے پر نہ کر اُن کے نظر“
”اب توں جائیگی تیری اُن سے سانٹھ“
”سخت مشکل ہوگا، سلجھانا تجھے“
”یہ جو محفل میں اُڑھاتے ہیں تجھے“
”ایک دن تجھ کو زادی لگے نہیں“
دل نے سُن کر، کانپ کر کھانچ دیا
رشتہ ”درِ گردنم افگندہ دوست“
میں بزد ہر جا کہ خاطر خواہ اُداست“ لے

لے کئے دل سررشتہ آزادگی
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
بسکہ تیرے حق میں کھتی ہے زیاں
یہ نہیں منگے کسو کے یا غنار
کھینچ لیتے ہیں یہ دُورے ڈال کر
لیکن آج سر کو پڑگی اسی گانٹھ
قہر ہے دل ان میں اُلجھانا تجھے
بھول مت اس پر اُڑاتے ہیں تجھے
مُفت میں ناحق تکتا دینگے تمہیں
غوطے میں جتا کر، دیا کٹ کر جواب

قطعات

قطرہ

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک
کہاں ہے ساقیِ مہوش کہاں ہے ابرِ طیر؟
رہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہرِ افشانی
بیارِ لالائے گلزارِ گوں ! بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو نکلا دیکھے
درِ حضور پر اے ابرِ بار بار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
”امیرِ کلبِ علی خاں جییں ہزار برس“
جنابِ قبلہِ سعادت ! اس بلا کش نے
کئی ہزار برس، بلکہ بیشمار برس
بڑے عذابِ کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے، کہ یہ ایسا ہوسازِ گار برس ہے



قطرہ

ہند میں اہل تَن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آباد دکن، رشکِ گلستانِ اَرَم
رام پور، اہل نظر کی ہے نظریں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعہٴ مَمُور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرفِ نژادِ اَدَم
رام پور، ایک بڑا باغ ہے، از روئے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خورم
جس طرح باغ میں سائون کی گھٹائیں بریں
ہے اُسی طور پہ یہاں دجلہٴ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی حناں سے مُدام
دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم

صبحدم باغ میں آجائے، جسے ہو نہ یقیں
 سبزہ و برگ گل و لالہ پہ دیکھے شبہم
 حَٰبِذَا باغِ ہُمَایُونِ تقدسِ آشمار!
 کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
 مُسَلِّکِ مشرع کے، ہیں راہرو و راہ شناس
 خضر بھی یہاں اگر آجائے، تو لے ان کے قدم
 مدح کے بعد دُعا چاہیے، اور اہل سخن
 اس کو کرتے ہیں بہت بڑھکے بہ اغراق رقم
 حق سے کیا مانگیے، اُن کے لیے جب ہو موجود
 تلک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و عِلْم
 ہم نہ تسلیغ کے مائل، نہ غلو کے متائل
 دو دُعائیں ہیں، کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
 یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
 دو وہ چیزیں، کہ طلبگار ہے جن کا عالم
 اولاً عمرِ طبعی، بہ دوامِ اقبال
 ثانیاً دوستِ دیدارِ شہنشاہِ اُممؐ لے

قطعہ تاریخ اختتام کتاب

سلیم خاں کہ وہ ہے نور چشم دہل خاں
 تمام دہریہ اس کے مطلب کا چرچا ہے
 اُسے فضائل علم و ہنر کی افزائش
 کہ بحث علم میں، اطفالِ بجدی اس کے
 عجیب نسخہٴ نادر، لکھا ہے گلِ سنے
 نہیں کتاب ہے اک منبعِ بحکاتِ برین
 کل اس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے
 کیا یہ جسد، کہ تو اس میں سوچا کیا ہے
 ”لکھا ہے نسخہٴ تحفہ“ یہی ہے سالِ تمام ۵

۱۲۷۹ھ

قطعہ

اے جہان آفریں، خداے کریم!
 نامِ میکلوڈ جن کا ہے مشہور
 صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم
 یہ ہمیشہ بسد نشاط و سرور

عمرِ دولت سے شادمان رہیں
اور غالب پہ مہربان رہیں لے

قطعہ

گورگاہوں کی ہے جتنی عزت، وہ یک قلم عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی
سویہ نظرِ فرورِ قلمدانِ نذر ہے مسٹر کوآن صاحبِ عالی مقام کی لے

سہرا لے

خوش ہو، اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

لے انشائے غالب (قلمی) ۲ : ۳ - لے خم خانہ مجاہد (۱) : ۸۱

لے شہزادہ جواں بخت کا نکاح یکم اپریل ۱۸۵۲ء کو ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سہرا اس تقریبِ دو چار دن پہلے لکھا گیا ہوگا۔ لیکن دیوان کے جو تین ایڈیشن اس کے بعد شائع ہوئے، میرزا نے اس سہرے کو ان میں شامل نہیں کیا، حالانکہ ”بیانِ مصنف“ جو اس کا نتیجہ اور شاخساز تھا وہ سب میں موجود ہے۔ البتہ ”نگارستانِ سخن“ (۱۸۶۳ء) میں شامل ہے۔ بعد میں یہ غالباً ”آبِ حیات“ (مصنف مولانا محمد حسین آزاد) سے لے کر دیوان میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ سہرا اُسی زمانے میں دہلی اردو اخبار اور قرآن السعدین میں چھپا تھا۔ لے شہزادہ لے - ۲۹۵

کیا ہی اس چاند سے ٹکڑے پہ بھلا لگتا ہے !
 ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
 سر پہ چڑھنا تجھے پہتا ہے پر اے طرفِ کلاہ !
 مجھ کو ڈر ہے، کہ نہ چھینے تیرا لبس سہرا
 ناؤ بھر کر ہی پر دئے گئے ہونگے موتی
 ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
 سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
 تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
 رخ پہ دو لھا کے جو گرمی سے پسینہ چمکا
 ہے رگ ابر گہر بار سہرا
 یہ بھی اک بے ادبی تھی، کہ قبا سے بڑھ جائے
 رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا
 جی میں اترا میں نہ موتی، کہ ہمیں ہیں اک چیز
 چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر، سہرا

لے گ: سر پہ چڑھنا تجھے زیادہ براے طرفِ کلاہ سے لگ: لاتے گ: گ: گ: گ:
 ہونگے فراہم گ: رخ دوسرے جو گرمی میں پسینہ چمکا گ: بھڑ گ: اترا گ:

جب کہ اپنے میں سادیں نہ خوشی کے مارے
 گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر، سہرا!
 رُخ روشن کی دمک، گوہر غلطاں کی چمک
 کیوں نہ دکھلائے فردِ غم و اخترا، سہرا
 تارِ ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابر بہار
 لائیکا تابِ گراں باری گوہر، سہرا
 ہم سخنِ فہم ہیں، غالب کے طرف دار نہیں
 دکھیں اس سہرے سے کہ دے کوئی بہتر سہرا!

سہرا

ہم نشین تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں
 بزمِ شادی ہے فلک، کا بجشاں ہے سہرا
 ان کو لڑیاں نہ کہو، جس کی موجیں بکھو
 ہے تو کشتی میں، ولے بحر رواں ہے سہرا

لے دکھیں، کہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

لے بیاض ثواب علاء الدین احمد خاں علائی (قلبی)

سہرا

چرخ تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا
جانک کا دائرہ لے، زہرہ نے گایا سہرا
ریشک سے لڑتی ہیں، آپس میں الجھ کر لڑیاں
باندھنے کے لیے جب سر پہ اٹھایا سہرا

قطعہ تاریخ

آبِ دِتاب انطباع کی پائی	اس کتاب طربِ نصاب نے جب
ایک صورتِ نئی نظر آئی	فکرِ تاریخِ سال میں، مجھ کو
دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی	ہند سے پہلے سات سات کے دو
باہزاراں ہزارِ زیبائی	اور پھر ہند سے تھسا بارہ کا
بے شمولِ عبارتِ آرائی	سالِ جبری تو ہو گیا معلوم
ہے جدِ اگانہ کارِ فرمائی	مگر اب ذوقِ بذلِ سنجی کو
بہ اُمیدِ سعادتِ افزائی	سات اور سات ہوتے ہیں چودہ

لے لال قلعہ کی جھلک (ناصرِ نذیرِ فراق) : ۳۰

غرض اس سے ہیں چارہ معصوم جس سے ہے چشمِ جاں کو زیبائی

اور بارہ امام ہیں بارہ جس سے ایماں کو ہے توانائی

اُن کو غالب یہ سال اچھا ہے

جو اُمت کے ہیں تو لائی لے

خطِ منظوم بنامِ علانی

بس کہ فعالِ مایوسِ نید ہے آج
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
کوئی واسطے نہ آسکے یاں تک
میں نے مانا، کہ بل گئے، پھر کیا؟
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ہر کشورِ انگلستان کا
زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا
گھر بن ہے نمونہ زنداں کا
تشنہ خوں ہے، ہر مٹلاں کا
آدمی واسطے نہ جا سکے یاں تک
وہی رونا تن و دل و جاں کا
سوزشِ داغِ ہائے پنہاں کا
ماجرا وید ہائے گریاں کا

لے سراپا سخن : ۳۹۳ - لے یعنی چاندنی چوک - لے مراد لوہارو

لے مراد دہلی - لے دیدہ ہائے - ۲۹۹

اس طرح کے دصال سے، یارب !
کیا مجھے داغ و دل سے حیراں کا لہ

خط منظوم بنام علانی

خوشی ہے یہ، آنے کی برسات کے
سراغ از موسم میں اندھے ہیں ہم
سوانح کے جو ہے مطلوب جاں
ہوا حکم باورچیوں کو، کہ ہاں !
وہ کتنے کہاں پائیں، اُلی کے پھول
دہ کڑوے کر لیے کہاں سے منگائیں
پہیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
کہ دلی کو چھوڑیں، لوہار کو جائیں
نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ابھی جا کے پوچھو، کہ کل کیا پکائیں ؟
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو، اس کو کیا، کھا کے ہم، حظ اٹھائیں تہ

لے اردو سے منقول : ۳۰۳ : خطوط غالب : ۳۳۰

میں آندھی۔ پرانے طرزِ تحریر کے لحاظ سے یہ لفظ آندھی اور اندھے دونوں پڑھا جاسکتا ہے
چونکہ گرمی کے موسم میں لوہار دیں رنگستانی علاقہ ہونے کے باعث بہت آندھیاں ملتی ہیں،
جن کا رخ دلی کی طرف سے ہوتا ہے اس لیے آندھی کی قرأت بھی درست ہو سکتی ہے۔

قطعہ

اے منشی خیرہ سر! سخن ساز نہ ہو غصّ فور ہے تو، مقابل باز نہ ہو
آواز تری بجلی، اور آواز کے ساتھ لاکھسی وہ لگی، کربس میں آواز نہ ہو

قطعہ

کیا ان دنوں بسر ہو، ہماری فراغ میں کچھ تفرقہ رہا، نہ دل و درد و داغ میں
چاہا کچھ شوق، جو موسیٰ نے طور پر یہاں دیکھتے ہیں رُز و ہی ہر چراغ میں
یہ کنت و وقار، خلائی! یہ وحشتیں
شورش ہے کچھ ضرور، تمہارے دماغ میں تھ

مرثیہ

ہاں اے نفیس بادِ سخن! شعلہ فشاں ہو اے وجہِ خوں! چشمِ ملائکہ ڈاں ہو
اے زمزمہ تم! لبِ عیسیٰ پہ فناں ہو اے ماتیانِ مشہرِ معصوم کہاں ہو

۱۔ لطافتِ نجیبی: ۱۵۔ ۲۔ بیاض نواب علاؤ الدین احمد خاں خٹائی

مرحوم والی لودھارو۔ ۳۔ مظلوم۔

بگڑی ہے بہت، بات بنائے نہیں بنتی
 اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی
 تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
 ماتم میں شہ دیں گے ہیں سوا نہیں ہم کو
 گھر بچونے میں اپنے مایا نہیں ہم کو
 گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
 یہ خرگزنہ پا یہ جو مدت سے بچا ہے
 کیا خیمہ ششیرے رتبہ میں سوا ہے !
 کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
 کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
 کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا !
 ہو گا دل بیتاب کسی سوختہ جاں کا
 اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
 گزما نہیں اس رُوسے کہو برق نہیں ہے

سَلام

سلام اُسے کہ اگر بادشاہ ہیں اُس کو
 تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے ہوا کہیں اُس کو
 زبادشاہ نہ سلطان یہ کیا تائش ہے !
 کہو، کہ خاسر آلِ عباس کہیں اُس کو

۷ بچا ! بچا ۷ ۷ ۷ نقشا ۷ ۷ یہاں ۷ ۷ عالم -

۷ اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ۷ جلوہٴ خضر (۱) : ۲۲۴ - ۲۲۵
 ۳-۲

خدا کی راہ میں شاہی دُسر و کیسی؟
 خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا
 فروغ جو ہر ایماں جُشینؑ ابنِ علیؑ
 کھینِ بخشش اُمت ہے بنِ نبیؑ پُرتی
 مسیحؑ جس سے کرے اخذ فیضِ جانِ بخشش
 وہ جس کے ماتیوں پر ہے سبیلِ سبیل
 عدو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
 بہت ہے پایہ گردِ رہِ حُسنِ بلند
 نظارہ سونے یاں تک ہر ایک نہ خاک
 ہمارے درد کی یاربؑ کہیں دوا نہ ملے
 ہمارا اُنٹھ ہے کہ دیں اُس کے حُسنِ صبر کی ادا
 زماں نافہ کف اُس کے یں ہے کہ اہلِ یقیں
 وہ ریگِ تفتہ دادی پہ گامِ فرسا ہے
 امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
 یہ اجتہادِ عجب ہے کہ ایک دشمن دیں

کہو، کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اُس کو
 اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اُس کو؟
 کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اُس کو
 اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اُس کو
 ستم ہے کُشتہ تیغِ جفا کہیں اُس کو
 شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اُس کو
 کہ جنِ دامنِ ملکِ سب بجا کہیں اُس کو
 بقدرِ فہم ہے، اگر گمبیا کہیں اُس کو
 کہ تو کُٹ جو ہر تیغِ قضا کہیں اُس کو
 اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اُس کو
 مگر نبیؑ و علیؑ مگر جسا کہیں اُس کو
 پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اُس کو
 کہ ظالمانِ حُندارِ مہنا کہیں اُس کو
 پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اُس کو
 علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اُس کو ت

لے کبھی نہیں مرتے۔ لے لوگ۔ لے متفرقاتِ غالب میں یہ شعر چھپنے سے رو گیا ہے۔

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
 علیؑ کے بعد سُن اور سُن کے بعد حسینؑ
 نبی کا ہونا جسے اعتقاد کا فر ہے
 رکھے امام سے جو شخص کیا کہیں اُس کو
 بھرا ہے غالب دل خستہ کے کلام میں درد
 غلط نہیں ہے، کہ خونیں نوا کہیں اُس کو لے

رباعیات

رُقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
 شاقبِ حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
 حاجی کلو گو دے کے بیوجہ جواب
 غالب کا پکا دیا کیسبِ اتم نے لے



اے روشنی دیدہ شہاب الدین خاں!
 کٹا ہے تباؤ، کس طرح سے مِضایں؟
 ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟
 سُنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن؟



جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
 کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
 دہری کیونکر ہوا جو کہ ہو دے صوفی؟
 شیعی کیونکر ہوا، ماورا را تنہری؟

لے الفاظ: ستمبر ۱۹۳۳ء؛ متفرقاتِ غالب: ۱۴۱-۱۴۲

لے اردو سے لیتی: ۲۲۰۰ سٹک یادگارِ غالب: ۶۸۱

فردیات

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ، غالب! غرقِ بید نہیں لے



ایرِ روم ہے، کہ بزمِ ظرب آمادہ کرد
برنی ہستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو لے



بہا ہے یاں تک اشکوں میں، غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تریں، ہر اک پارہٴ دل، پلے در گل ہے



دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ، سو آپ کا
دل لیجیے، مگر مے اراں نکال کے



شمسیرِ صاف یار، جو زہرِ اب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہے، کہ بہ رخسارِ سادہ ہو لے



دیکھتا ہوں اسے، جتنی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو لے

منستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب باتوں مجھے یہ رنگِ زرد ہے، چمنِ زعفران مجھے



جگر سے ٹوٹے ہوئے مٹو کی ہے سناں پیدا دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا



نیازِ عشق، خرمنِ سوزِ اسبابِ ہوس، بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق، مشتبہِ غارِ خوس، بہتر



یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ! غلط کی تصور نے بصرِ اے ہوس راہ غلط



واہ نو ہوں کہ فلکِ عجز سکھاتا ہے مجھے عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلّاتا ہے مجھے



صبا! لگا وہ طپانچے طرف سے بل کی کرے غنچہ بگل سوسے آشیاں پھر جائے



زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کبھی جانے ہے ایسے منستے کو رُلا یا ہے کبھی جانے ہے

شہم کیا کہیں کسی سٹے کیا ہے طریق اپنا! مذہب میں ہے کوئی ملت نہیں ہے کوئی

گلشن دہر بھی ہے کوئی سراے ماتم شہنم اس بلغ میں جبے، تو گریاں آئے

دو رنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی ہیں سب کہ مژدوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

پھر مرتبہ بڑھایا مرا، نفی غیر نے آیا ہر ایک مکاں نظر، لامکاں مجھے

پیری میں بھی کمی نہ ہوئی بھانکتا تک کی روزن کی طرح، دید کا آزار رہ گیا
وہ مرغ ہے خزاں کی صوبت سے بے خبر آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

دم واپس برسرِ راہ ہے عزتِ نرو! اب اللہ ہی اللہ ہے

لے مندرجہ ذیل چھ اشعار نواب علاؤ الدین احمد خاں مرحوم والی لوہارو کی بیاض سے





حُلّی رفیق رہ تھی، عدم یا وجود تھا
 میرا سفر طالع چشمِ جہود تھا
 پوچھا تھا اگرچہ یار نے احوالِ دل، مگر
 کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا
 خورشیدِ شبنم آستانہ ہوا، ورنہ میں، آسدا!
 سرتما سدم، گزارشِ ذوقِ جہود تھا

ہے کہاں، تمنا کا دوسرا قدمِ یارب!
 ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پایا
 ہے دماغِ تجلیت ہوں، رشکِ تجاں تاکے
 ایک ایسی، تجھ کو عالمِ آستانِ پایا
 خاکِ بازیِ امید، کارِ حناءِ طفلی
 یاس کو دو عالم سے، لبِ سبزہ وا پایا

شبِ نظارہ پرور تھا، خوابِ میثاقِ سر کا
 صبحِ سوجھ گئی کو نقشِ بویا پایا

کارخانہ شے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
 میری قسمت کاٹہ ایک آدھ گریباں نکلا
 ساعِ جلوہ شہساز ہے ہر ذرہ خاک
 شوقِ دیدار، بلا آئی سہ سا ماں نکلا
 کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آنر
 جس کو دل کہتے تھے، سویر کلاہیاں نکلا

دستِ رحمتِ حقِ دلیہ کو بخشا جاوے مجھ سا کافر، کہ جو مسنونِ معاصی ہوا

دیدہ تاول ہے یک آئینہ چرخان کس نے خلوتِ ناز پہ پیرایہ محفلِ بانہا؛
مطربِ دل نے مئے تارِ نفس سے غالب! ساز پر رشتہ پہے نغمہ بیدلِ بانہا

واں جویم نغمہ ہے سازِ عشرت تھا اسدا ناخنِ غم یاں سترِ انفس مضراب تھا

اگر اسودگی ہے مدعاے رنجِ بیتابی نثارِ گردشِ پیمانہ سے، روزگار اپنا

ہوا سے صبح کی غم گریاں چلی گئی ہے دہانِ زخم پیدا کر، اگر کھا تا ہے غم میرا

اسدا! یہ مجرور ہے سامانی فرعون توام ہے جسے تو بندگی کہتا ہے، دعویٰ ہے خدائی کا

ہم نے دشمنکہہ برہم جہاں میں جوں شمع شعلہء عشق کو اپنا سر و ساماں بھا

مٹکا و چشمِ حاسد دام لے لے ذوقِ خود بینی! تماشائی ہوں وحدتِ خانہ آئینہ دل کا

شر و فرصت نگر! سالان یک عالم چرخاں ہے بقدر رنگِ بیاں گردش میں ہے پیا بھل کا
 سراسر تہمتن کو شش جہت یکے صر جولاں تھا ہوا و ماندگی سے رہرواں کی فرق منزل کا
 مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب!
 عصاے خضر صحرائے سخن ہے خامرہ بیدل کا



بصورتِ مختلف، بمعنی تاسف اسد! میں تبسم ہوں پر شمر دگاں کا



ضعفِ جنوں کو وقتِ پیشِ درہی دور تھا اک گھر میں مختصر سایا بیاں ضرور تھا
 اے دے بغفلتِ نگر شوقِ دریاں ہر پارہ سنگِ تختِ دل کو ہر طور تھا
 درسِ پیش ہے برق کو اب اس کے نام سے وہ دل ہے کہ جس کا تخلص صبور تھا
 جنت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منظر جو ہر سوادِ جلوہ مرثگانِ خور تھا

ہر رنگ میں جلا، اسدِ فتنہ انتظار
 پر دانہ تجلی شمعِ ظہور تھا



خود رستی سے رہا باہم دگر نا آشنا بیکسی میری شریک، آمینہ تیرا آشنا
 آتشِ مو سے داغِ شوق ہے تیرا تپاک در نہ ہم کس کے ہیں اے داغِ تمنا آشنا

بیدار غمی شکوہ سنج رشک ہم دیگر نہیں
یا تیرا جام مے خمیازہ میرا آشنا
رہی یک شیرازہ وحشت میں جزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ گل نا آشنا



اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو، پر اسند
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا



بُت پرستی ہے بہارِ نقشِ بندی ہے ہر
ہر صبرِ رخا میں یک نالہ نا قوس تھا
کل اسد کو ہم نے دیکھا، گوشہ غم خانیں
دست بر سر، سر بر زانو سے دلِ یاس تھا



رکھا غفلت نے دور افتادہ ذوقِ فنا، ورنہ
اشارتِ فہم کو، ہر ناخن بُریدہ، ابرو تھا



بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب
سرتارِ نظر ہے رشتہ تسبیح کو کب
کرے گر، فکرِ تعمیرِ خرابی ہے دک، گردوں
نہ نکلے خشتِ مثلِ استخوانِ بیرونِ قالب
کرے ہے حُسنِ خواباں پردہ میں مشاطگی اپنی
کہ ہے تہِ بندیِ خط، سبزہ خط در تہ لب

استد کو بہت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالہ ناکوس میں در پردہ "یارب اے"



چہرہ میں شرم ہے باوصفِ شہرت، اہتمامِ اُس کا
نہیں میں، جوں شرابِ سنگ، ناپیدا ہے نامِ اُس کا
ہر اُتسارِ نگاہِ خاص ہوں، محلِ کشِ حسرت
بساوا ہو غنا، بغیرِ تعارفِ لطفِ عامِ اُس کا
استد! سوداے سرسبزی سے، ہے تسلیمِ رنگیں تر
کو کشتِ لطفِ اُس کا، ابرو ہے پروا حسرتِ اُس کا



مشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
آخر کار غزلتِ اسیرِ رات ہوا
دل دیوانہ، کو دارستہ ہر مذہب تھا
شوقِ سامانِ فضولی ہے، وگردِ غالب!
ہم میں سرمایہٴ ایجابِ تمنا کب تھا



ایک کام بے خودی سے کوئی بہا ہوا
دشتِ آرزو سے، یہ جاصلی اول ہے
آغوشِ نقشب پامیں کیجئے نشا ہوا
پیمانہ ہوا ہے، شستِ خبا ہوا

دیوانگی اسد کی، حسرت کبھی ظرب ہے
در سربو اسے غمشن، در دل غبار صحرا



وحشی بن، صیاد نے ہم ز مخوروں کو کیا رام کیا
رشتہ نکاح جیب دریدہ، صرف قماش دام کیا
مہر بھائے نامہ لگائی، بربہ یک نامہ رساں
قائل ٹھیکیں سلج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا
شام نسیم راقی یار میں جو شخیرہ سری سے ہم نے اسد!
ماہ کو، در سبج کو اکب، جاے لشین امام کیا



سیر آنسوئے تماشا ہے طلبگاروں کا، خضر عشاق ہے اس دشت کے آواروں کا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے، خدا غیر کرے! رنگ اڑتا ہے ہمتاں کے ہوا داروں کا
اسد! اسے ہرزہ ورا انالہ بہ غوغا تا چاند!
حاصلہ تنگ نہ کر، بے سبب آزاروں کا



بوقت کعبہ جوی ہا، جس کرتا ہے ناتوسی
کہ صبرا، فصل گل میں، رشک ہے بختا نہ ہیں کا

اسد! اربابِ فطرتِ قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
 سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاقِ تحسین کا

☆
 وردِ اسمِ حق سے، دیدارِ صنم حاصل ہوا
 رشتہٴ تسبیحِ تبارِ جبارِ دہ منزل ہوا
 عیبِ گدا دریافت کرنا ہے ہنرمندیِ اسد!
 نقص پر اپنے ہوا جو مطلع، کاہل ہوا

☆
 سرِ منزلِ ہستی سے ہے صحرائے طلبِ دہ
 جو خطِ بے کفِ پایہ، سو ہے سلسلہٴ پایہ

☆
 یہ ہنر نامہ جو بوسہ گلِ پیامِ رہا
 ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
 ہوانہ مجھ سے بجز دردِ حاصلِ صیاد
 بسانِ اشکِ گرفتارِ چشمِ دام رہا
 دل و جگر تفریق سے جل کے خاک ہوئے
 ولے ہنوز خیالِ وصالِ خام رہا
 شکستِ رنگ کی لائی سحرِ شبِ سنبل
 پہ زلفِ یار کا افسانہ نا تمام رہا
 دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا!
 کہ شبِ خیالِ بوسوں کا ازدحام رہا

نہ پوچھ حالِ شبِ دروڑِ ہجر کا، غالب!
 خیالِ زلفِ درِ رخِ دوستِ صبح و شام رہا

☆
 قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا پہنچ
 رفتارِ نہیں، بیشتر از لغزشِ پا پہنچ

حیرت ہمہ اسرار پہ مجبور خموشی ہستی نہیں مجربستین بیانِ وفا بچ
 کس بات پہ مغرور ہے؟ اے عجزِ تمنا! سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا بچ
 آہنگِ اسد میں نہیں مجرِ نغمہ بیدل
 ”عالم ہمہ افسانہ ما وارد و ما هیچ“

زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسد!
 غفلت آراہی یاراں پہ ہیں خنداں، گل و بیج

تھی نگہ میری نہا نخواستہ دل کی نقاب بے خبر جیتے ہیں اربابِ ریائیرے بعد
 تھیں گدڑتہ احباب کی بندش کی گیارہ منتفرق ہوئے میرے رقتا میرے بعد

ہم نے سوزِ خیمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
 گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہاں باد
 تنج درکت، کف بلب، آتا ہے قابل اس طرف
 مژدہ باد، اے آرزو سے مرگِ غالب! مژدہ باد

تو پست فطرت اور خیالِ بابلند اے طفلِ خود معاطل! قد سے عصا بلند

مژگان باز ماندہ سئے دست و عابند
یک آساں ہے مرتبہ پشت پابند
کار بہانہ جوئی چشم عیابند

رکتا ہے انتظار تماشاے حسن دست
قربان اور ریزہ چشم حیا پرست
ہے دلبری کیس گرایہاؤ یک بچاؤ

بڑیاں عرضِ فسون ہوس گل تاچند
شع گل تار کے پروانہ و بیل تاچند
ناکسی آئیستہ ناز توکل تاچند

چشم بے عون مل دل تہی از جوش بچاؤ
بزم دلخ طرب باغ کشاؤ پر رنگ
سادگی ہے عدم قدرت ایساؤ دغا

استبد مستہ، گرفتار دو عالم اودام
مشکل آساں کن یک مسئلہ اتفاخل تاچند

برنگئے ہے نہاں در ہر استخوان فریاد
ہوئی ہے محو، بہ تقریب استخوان فریاد
جہان داہل جہاں سے جہاں جہاں فریاد
ز دست شیشہ دہائے دوستان فریاد

نوازشِ نفس آشنا کہاں، ورنہ
تغافل آئینہ دارِ غمخشی دل ہے
ہلاک جینہ سہری، لغتہ وجود و عدم
جواب سنگدل ہائے دشمنان ہمت

ہزار آفت و یک جان ہے نواسے اسدل
عدا کے واسطے، اے شاہ، بیکساں! فریاد

☆
 رگِ گلِ چادۂ تارِ نگہ سے صد موافق ہے
 طینگے منزلِ اُلفت میں ہم اور عندلیبِ آخر
 غرورِ ضبط، وقتِ نزع کو ناہمستاری سے
 نیازِ بالِ افشانی ہوا بسرِ و شکبِ آخر
 اسد کی طرح، میری بھی، بغیر از صبحِ رخساراں
 ہوئی شامِ جراتی، اے دلِ حسرتِ نصیبِ آخر

☆
 سلمِ کرنا، گداے عاشق پر
 دو سترا بھگستہ رسیدہ سے
 نہیں شاہانِ حُسن کا دستور
 دشمنی ہے، وصال کا مذکور
 زندگانی پہ استہادِ غلط
 ہے کہاں قیصر؟ اور کہاں مغفور؟
 کیجئے بچوں اٹک، اور قطرہ زنی
 اے اسد! ہے ہنوز دلی دُور

☆
 اے چرخِ افگ بر سرِ تعمیرِ کائنات
 لیکن بنائے عہدِ وفا، استوار تر

تیز تر ہوتا ہے خشم تند خویاں عجز سے
 ہے رگ سنگِ فسان تیغِ شعلہ، خار و خس
 سختی راہِ محبت، منعِ دھنلِ غیر ہے
 پیچ و تابِ جادہ ہے یاں جو ہر تیغِ عکس
 اے اسد! خود ہم اسیر رنگِ بوے باغ ہیں
 ظاہرِ اُصیا وِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

کفر ہے، غیر از دُورِ شوق، رہبرِ خواستن
 راہِ صحراے حرم میں، ہے جرس، ناقوس و بس
 یک جہاں گلِ تختہٴ مشقِ شگفتن ہے، اسد!
 عینِ خاطر رہا افسردگیِ ناقوس و بس

اے آرزو، شہید وفا! خونِ ہانہ مانگ
 برہم ہے برہم غنچہ، بے یک جنبشِ نشاۃ
 میں دودِ گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں
 نظارہ و گیر و دلِ خوینِ نفسِ دگر

جز بہرست بازوئے قاتلِ دعانہ مانگ
 کاشاۃ بسکرتِ رنگِ ہوا فلان ہوا نہ مانگ
 دشمن سمجھ، ولے نگہ آشنا نہ مانگ
 آئینہ دیکھ، جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ

بقدرِ حوصلہ عشقِ جلوہ ریزی ہے
 وگرنہ خانہ آئینہ کی فضا معلوم
 بہارِ درگرو غنیمتِ شہرِ جلاں ہے
 طلسمِ ناز، بجز تنگیِ قبا معلوم
 طلسمِ خاک، کیں گاہِ یک جہاں سودا
 ہمرگ، تیکہ آسائشِ فنا معلوم
 اسدل، فریفتہ انتخابِ طرزِ جفا
 وگرنہ دلبسری وعدہ وفا معلوم

فرطِ جوانی سے ہیں شبہائے حیرانی
 جوں زبانِ شمع، داغِ گرمیِ افسانہ ہم
 جانتے ہیں جوشِ سوداے زلفیاریں
 سنبلِ بالیدہ کو کوسے سبِ دیوانہ ہم
 بسکہ وہ چشم و چراغِ مغلِ اغیار ہے
 چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتمخاں ہم

از آنجا کہ حسرتِ کسبِ یار ہیں ہم
 رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم
 تماشاے گلشنِ تمنائے چیدن
 بہارِ آفرینِ انگنہ گار ہیں ہم
 نہ ذوقِ گریاں، نہ پردائے داماں
 نگہ آشنائے گلِ دُخار ہیں ہم
 اسدل! شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
 ہجومِ تمنائے لاپسار ہیں ہم

غالب! بے تہ فہم تصور سے کچھ پرے ہے مجز زندگی، جو علیؑ کو خدا کہوں

مقیو کے شعر کا حوالہ کہو کیا بغالب! جس کا دیوان کم از کم شبن کشمیر نہیں

جائیکہ پاسے سیل بلا دریاں نہیں دیوانگیاں کو واں ہوسرِ خانماں نہیں

ناگوار ہے میرا حسان صاحبِ قطاں ہے زرِ گل بھی نظریں جو ہر فولادیاں
قطرہ دے خونِ سیل نیپہ امان ہر اسدا! ہے تماشا کردنی، گل پینی جلا دیاں

ہے نزاکت بسکہ فصیل گل میں معمارِ حمن وقت بے گرجیں سکیں نیلخانی کرے
قالب گل میں حل ہے خشتِ دیوارِ حمن یوسف گل جلوہ فرما ہے، بازارِ حمن

پھر حلقہ کا کل میں پڑیں دید کی راہیں پایا سر ہر فزہ، جگر گوشہٴ وحشت
جوں دود فرام ہو میں روزن میں نکلیں ہیں مرغے سحر، شقائق کی کلاہیں
و اما ندگی شوق ترا شے ہے پناہیں دیر و حرم آہینہ و مکرارِ تنہا

پر عکس آئینہ یک فرد سادہ رکھتے ہیں
سر سے پائے پتے ناخدا وہ رکھتے ہیں

تمیز رشتی دنگی میں لاکھ ہاتیں ہیں
بہز اداں رگ گردن ہے رشتہ گزار

شام خیال زلف سے صبح دمیدہ ہوں
غمخانہ جنوں میں دماغ رسیدہ ہوں
تسبیح اشکباے زخماں چکیدہ ہوں
جوشائے پشت بوندوں گزیدہ ہوں
میں عذیب گلشن نا آفریدہ ہوں
مضرب تار داسے گو سے بریدہ ہوں
غوناہ بھلاہل حسرت چشیدہ ہوں

سوداے عشق سے دم سر د کشیدہ ہوں
دوران سر سے گردن ساغر ہے مقبل
کی شعل ستارہ شامی میں غمخیز
ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشان
ہوں گرمی نشاط تصور سے نفس سنج
دیتا ہوں کشتگان کو سخن سے سرپوش
ہے جنبش زباں بہن، سخت ناگوار

جوں بڑے گل ہوں گرچہ، گراں بار مشت زر
لیکن، استدل! بوقت گزشتن جریدہ ہوں

نہ انشا معنی مضموں، نہ اِطلا صورت موزوں
عنایت نامہاے اہل دنیا ہرزہ عنوان ہیں

مُرا تَش ہمارا کو کب اقبال چمکا دے
وگر نہ، مِثلِ خارِ خشک، مردودِ گلستاں ہیں
اسد! بزمِ تماشا میں، تغافلِ پردہ داری ہے
اگر دُھانپے تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ عریاں ہیں



اے نواس از تماشا! سر کف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں
بے تماشا نگاہِ سوزِ تازہ، ہر یک عضو تن
جوں چراغانِ دِوالی صفِ بصف جلتا ہوں میں
شمع ہوں، تو بزم میں جا پاؤں غالب کی طرح
بے محل، اے مجلسِ آراے نجف! جلتا ہوں میں



فدا دگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالب!
برنگِ جادہ، سر کوئے یار رکھتے ہیں
بُسانِ دشتِ دل پر غبار رکھتے ہیں



ہو سکے کب، کُلفتِ دل، مانعِ طوفانِ اشک!
گردِ ساحل، سنگِ راہِ جو شش دریا نہیں

ہے طلسمِ دہر میں، صد حشرِ پاداشیں عمل
آگہی، غافل! کہ یک امروز بے فردا نہیں
بسل اس تیغِ دوستی کا نہیں پتھا، اسد!
عافیت بیزار! شعلِ کعبتین اچھا نہیں



ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزت آبادِ صدف میں قیمت گوہر نہیں
کب تلک پھیرے اسد لبہائے تفتِ رزباں
طاقت لب تشنگی، اے ساقی کوثر نہیں

زلفِ خیالِ نازک و اظہارِ بقرار یارب! بیانِ شاذ کشِ گفتگو نہ ہو



ہم زانو سے تامل و ہم جلوہ گاہِ گلِ آئینہ بندِ خلوت و مغل ہے آئینہ
دل کا رگاہِ فکر و اسدِ جنوں کے دل یاں سنگِ آستانہِ بیدل ہے آئینہ



ہر داغِ تازہ، یک نلِ داغِ انتظار ہے عرضِ فضاے سینہ و دردِ امتحاں نہ پوچھو
کہتا تھا کل وہ نامِ رساں سے بسوزِ دل دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھو
نہ کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے، گر آہ



خلق ہے صفحہ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخِ دوز میں یک ورقِ گردانہ
میکدے میں نول افسردگی بادہ کشاں
سوجے ہل خطِ جام ہے برجامانہ
خواہشِ دل ہے زباں کو سب گفتِ بُریاں
کہ سخنِ گردِ زردمانِ ضعیفِ افشانہ
کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
بے ہر اک فردِ جہاں میں رُزقِ ناخواندہ
حیف بیجا سبلی اہلِ ریا پر، غالب !
یعنی میں مانده ز آں سُو و ازیں سورانده



کی ہے واہلِ جہاں نے بگستاںِ جہاں
چشمِ غفلتِ نظرِ شبہم خورِ نادیدہ
یاسِ آئینہ پیدائی استفا ہے
نا اُمیدی ہے پرستارِ دلِ رنجیدہ
واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے، غالب !
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ



شکوہ و مشکر کو ثمر، بیمِ دُامید کا سمجھ
خانہ آگہی خرابِ دل نہ سمجھ، بلا سمجھ
وحشتِ دردِ کیسی، بے اثر اس قدر نہیں
رشتہ عمرِ خضر کو نالہ ہمارا سمجھ

گرچہ خدا کی یاد ہے، کلفتِ ماسوا کچھ
شوق کو منفل زکرا، ناز کو اتجا کچھ

گاہ بخلد امیدوار، گرچہ جمیم بیناک
اے ہر آپسن خلق تشنہ، سخی استحاں



شوق کرے جو سرگراں بھل خواب پا کچھ
عکس کجاو کو نظر، نقشب کو تدعا کچھ
ہے یہ سیاق گفتگو، کچھ نہ سمجھ، فنا کچھ
گزہ نہیں یہ کو ہزار آپ کو تو صدا کچھ
زند تمام ناز رہ، خلق کو پار کچھ
اے دل وجاہِ خلق تو ہم کو بھی آشنا کچھ

کلفتِ ربطِ این و آن غفلتِ تدعا کچھ
جلوہ نہیں ہے دردِ سرتازہ صندلی نہ کر
ہے خطِ عجزِ ما تو، اول درسِ آرزو
شیشہ شکستِ اعتبارِ زنگِ بگردش استوار
نغمہ ہے محو ساز رہ، نشہ ہے بے نیاز رہ
نے سرورِ برگِ آرزو نے رہ درسم گفتگو

نغزشِ پاکو ہے بلد، نغمہ، یا علی! مدد
نوٹے گر آئینہ اسل! سمجھ کو خوں بہا کچھ



یک عمر نازِ شوخی عنوان اٹھائے

ہستی فریبِ نامہ موجِ سراب ہے



خواری کو بھی اک عار ہے عالیٰ نسبوں سے
جاتی ہے ملاقات کب ایسے سبوں سے

کیا پوچھے ہے برخود غلطی ہے عزیزیاں
گو تم کو رضا جوئی اغیار ہے، لیکن

مت پوچھ اسد! وعدہ کم فرصتی زیست
دو دن بھی جو کاٹے، توقیامت یقینوں سے



مجھے معلوم ہے، جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دُلوں! وہ بھی



کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور جو فانی!
سر پیٹے ہیں اپنا، ہم اور نیکنامی
ہر چند عمر گزری آرزوگی میں ایسکن
ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ نامتنامی
ہے یاس میں اسد کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گذرے مستوں کی تشنہ کامی



گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھالیتے اسد!
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے



کیا غم ہے اُس کو جس کا علیٰ سالام ہو اتنا بھی اے فلکِ زندہ! کیوں بے حواس ہے!

نظرِ نقص گدایاں کمال بے ادبی ہے
 کہ غارِ خشک کو بھی دعوئے چمن نسی ہے
 ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
 لبِ قلع پر کفِ بادہ، جوشِ تشنہ لبی ہے
 خوشادہ دل! کہ سراپا طلسمِ بجنہری ہو
 جنونِ میاسِ عالمِ رزقِ مدعا طلبی ہے
 چمن میں کس کی یہ بزمِ ہونی ہے بزمِ تماشا؟
 کہ برگِ برگِ سخن، شیشہِ ریزہ جلی ہے
 امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی
 علیؑ ولیؑ اسد اللہ، جانِ نشین نبی ہے

بے چشمِ دل، نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
 یعنی یہ ہر ذوق، ذوقِ انتخاب ہے
 تا چند پست فطرتی طسِجِ آرزو؟
 یارب! طے بلند ہی دستِ دعا مجھے
 یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
 اسے جوشِ عشق! بادہٴ مردِ آزما مجھے

کہوں کیا گر محوشی میکشی میں شعلہٴ رویاں کی!
 کہ شمعِ خانہٴ دل آتشِ مے سے فروزاں کی
 مجھے اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری تھی
 ولیکن کیا کروں آدے جو رسوائیِ نگرِ سیاں کی

وہ دیکھ کے خُسن اپنا مغرور ہوا غالب! صد جلوۂ آمیز یک صُبح جدائی ہے

ہم مشقِ فکر و صل و غمِ حجر سے، اسد! لائقِ تنہا نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

اسد! بندِ قبا سے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو، تو دکھلا دوں، کہ یک عالمِ گلستاں ہے

اسد! جمعیتِ دل در کنارِ یہ بخودی خوشتر
دو عالم آگہی، سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

عاشقِ نقابِ جلوۂ جانا چاہیے فانوسِ شمع کو پر پروانہ چاہیے
ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سرورِ بخشش پیاں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے

وقت اس افتادہ کا خوش! جو قناعت سے اسد!
نقشِ پائے سر کو تختِ سیمانی کرے

ہوا شرم تہی دستی سے وہ بھی سزنگوں آخر
بس اے زخم جگر اب دیکھ لی شورش نگہاں کی
بیاد گرمی صحبت، بزمِ شعلہ، دُکے ہے
چھپاؤں کیونکر غالب! سوزِ شین داغ نمایاں کی



باعثِ دامنِ دُگی ہے عمرِ فرست جو لے کر دیا ہے پایہ زنجیرِ رم آہو، لے



عروجِ نشہ ہے سترِ اقدم، مستِ چمنِ رویاں
بجائے خود، وگرنہ، سرِ دہلیزِ میناے خالی ہے
سیستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے
زیمِ بوحشِ طرب سے جامِ لہریزِ سفالی ہے
استد! اُنھنا قیامت قاستوں کا، وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں، بالیدنِ مضمونِ عالی ہے



ہو جہاں، تیرا دماغِ ناز، مستِ بیخودی
خوابِ نازِ گلِ رخاں، دودِ چراغِ کشتہ ہے

آتش افروزی یک شعلہ ایسا تھو سے
اے اسد! دسترس وصلِ تمنا معلوم
چشمک آرائیِ سد شہرِ چاغاں مجھ سے
کاش ہو قدرتِ برجدینِ اماں مجھ سے

بسکہ ویرانی سے گُفر دیں مجھے زیر و زبر
اے سرِ شوریدہ! نازِ عشق و پاسِ آبر
گردِ صحرائے حرم تا کو چہ زُنا رہے
یک طرف سودا و یک سوختِ دُستا رہے!

بہ سختی اے قیدِ زندگی، معلوم آزادی
شُر در بندِ دامِ رشتہ رگہائے خارا ہے

بذوقِ شوخی اعضا کُلفِ بارِ بستر ہے
مصافِ پیچ و تاب کشمکشِ ہر تارِ بستر ہے
مرثہ فریش رہ و دل ناتوان و آرزو مضطر
ہپائے خفتہ، سیرِ داوی پُر خارِ بستر ہے

ہوسکے کیا خاک، دست و بازو سے فرہاد سے
بیستوں، خوابِ گرانِ خسرو پر ویز ہے

☆
 توجہیں کھتی ہے شرمِ قطرہ سانی مجھے
 موج گردابِ حیا ہے چینِ پیشانی مجھے
 شوق ہے شلِ جاب از خوشیِ جزا بدن
 ہے گریاں گیرِ فرصتِ ذوقِ عربانی مجھے

☆
 شومِ طالع ہے ہوں ذوقِ محاصی میں سیر
 نازِ اعمال ہے تاریکی کو کب مجھے
 دردِ ناپیدا و حجبِ اہمتِ وارستگی
 پردہ واریا دگی ہے دسعتِ شرب مجھے

☆
 اسد! بہارِ تماشائے گشتِ انِ حیات
 وصالِ لالہ عذارا بنِ سرِ وقامت ہے

☆
 تماشاں جلوہ عرضِ کزائے حسن! کب تک
 آئینہ خیال کو دیکھا کرے کوئی

☆
 غم و عشرت قد مہوسِ دلِ تسلیمِ تیں ہے
 دُعا سے مدعا گم کر دو گاہِ عشقِ آئیں ہے
 پیامِ تعزیت پیدا ہے، اندازِ عیادت سے
 شبِ ماتم، تہِ دامانِ دُودِ شمعِ بالیں ہے

☆
 بزمِ ہستی وہ ماشا ہے کہ جس کو ہم اسد! دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشائے

☆
 عبرت طلب ہے حلِ معماے آگہی شبنم گدازِ آئینہ اعتبار ہے
 نخلتِ کیش و فاکو، شکایتِ چاہیے اے ندعی! طلسمِ عرقِ بے غبار ہے

☆
 کیلے ہے ترکِ دنیا، کاہلی سے ہمیں حاصل نہیں ہے حاصل سے
 پرِ انشاں ہو گئے شعلے ہزاروں رہے ہم داغ، اپنی کاہلی سے
 خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر پھرے ہم در بدر، ناقابل سے

☆
 جنوں افسردہ دیاں ناتواں، اے جلوہ! شوخی کر
 گئی یک عمرِ خودداری، بہ استقبالِ عنائی
 نگاہِ عبرتِ افسوں، گاہِ برق و گاہِ شعل ہے
 ہوا ہر خلوت و خلوت سے حاصل، ذوقِ تنہائی

☆
 شکستہ آسائشِ اربابِ غفلتِ پراسد! بیچ و تابِ دلِ نصیبِ خاطر آگاہ ہے



نہ حسرتِ قتل، نہ ذوقِ بیکراری
یک دم و صد دہائیے یک سٹ منہ عا ہے
بجائے میں اسد بھی بند تھا، گاہ گاہ ہے
حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے!



خانمانِ جبریاں غفلتِ معنی خراں
جب مجھے ہم بے گناہِ حمت کی کیا فقیر ہے!
چاہے گر جنت، جزاؤں وارثِ آدم نہیں
شوخیِ ایمانِ زاہد، سستیِ تدبیر ہے
آب ہو جاتے ہیں، رنگِ ہمتِ باطل سے مرد
اشک پیدا کر، اسد! گراہ بے تاثیر ہے



یقین ہے آدمی کو دستِ گاہِ فقر حاصل ہو
دمِ تیغ تو کل سے اگر پاسے سبب کاٹے



خبر نگہ کو نگہ، چشم کو عدد جانے
وہ جلوہ کر، کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
نفسِ بنالہ رقیب و نگہ بہ اشکِ عدد
زیادہ اُس سے گرفتار ہوں، کہ تو جانے
زباں سے عرضِ تمنا کے خامشی معلوم
مگر وہ خانہ بر انداز ”گفتگو“ جانے

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو، غالب! تو پھر
کیوں نہ دلی میں، ہر اک ناچیز تو آبی کرے

صبح سے معلوم اتنا ظہورِ شام ہے غافلاں! آغازِ کار، آئینہ انجام ہے

اے خوشا وقتے اگر ساقی یک نحتاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل، پسندِ مینا کرے
توڑ بیٹھے، جب کہ ہم جام و سُبُو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ تکلف ام، گو بربسا کرے

یہ رہن ضبط ہے، آئینہ بندی گوہر و گرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پرِ ہم ہے
اگر نہ ہوئے رگِ خواب صرفِ شیرازہ تمام دفترِ ربطِ مزاج، برہم ہے
استد! بہ ناز کی طبعِ آرزو، انصاف
کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے

کشت و غنچہ دہا عجیب نہ رکھ، غافل! صبا خرامی خواباں، بہار سا ماں ہے
اسد! جہاں کر علیٰ بر سر نوازش ہو کشا و عقدہ دشوار، کارِ آساں ہے

دامگاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں!
پرفشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے
اے ہوس! عرضِ بساطِ نازِ مُشتاقی نہ مانگ
جوں پڑاؤس، چندیں داغ، مُشکِ اندودہ ہے
کیا کہوں پرواز کی آوارگی کی کشمکش!
عافیت، سرمایہٴ بالِ دہرِ کشتودہ ہے
جس طرف سے آئے ہیں، آخرِ اُدھر ہی جا بیٹھے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم ہی بودہ ہے
پنہٴ یسنائی ہی رکھ تو تم اپنے کان میں
مے پرستاں! نا صبح ہی صفرِ گو، یہ بودہ ہے

کچھ نہیں حاصل تعلق میں، بغیرِ کشمکش
اے خوشا زندے، اگر مرغِ گلشنِ تجرید ہے
کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطرب ہے اسد
یا علی! وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

☆
 شمع آسا، چہ سہر دعویٰ و کوپاے ثبات ؛
 گل مسد شعلہ، بیک جیب شکیبائی ہے
 بوے گل، فتنہ بیدار و چین، جامہ خواب
 وصل بر رنگ پیش، کہوتِ رسوائی ہے

☆
 نوائے خفتہ اُلفت اگر بیستاب ہو جائے
 پیر پروانہ، تمار شمع پر مصناب ہو جائے
 بر رنگ گل، اگر شیرازہ بند، بخودی رہے
 ہزار آشفستگی مجموعہ یک خواب ہو جائے
 اسد! باد صفتِ عجز بے تکلف خاک گردیدن
 غضب ہے گز غبارِ خاطر احباب ہو جائے

☆
 تاجند، نازِ سجد و بختانہ کھینچے
 چوں شمع، دلِ خلوتِ جانانہ کھینچے
 عجز و نسیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
 دامن کو اُس کے آج حرفیانہ کھینچے

لے جنوں رے مشہد

ہے ذوقِ گریہ عسرمِ سفر کیجیے اسدا!
رختِ جونِ سیل بہ دیرانہ کیجیے



دامنِ دل بوجہم تماشا نہ کیجیے
اے مدعیِ انجالتِ بجانہ کیجیے
گلِ سرسبز، اشارہِ جیبِ دریدہ ہے
نازِ بہار، رُجزِ بقا ضا نہ کیجیے
حیرت، حجابِ جلوہ و وحشتِ غبارِ راہ
پاے نظرِ دامنِ صحرانہ کیجیے
واماندگی، بہانہ و دبستگیِ فریب
دردِ طلب بہ آبلہٗ پانہ کیجیے
خود نامہ بن کے جائیے، اُس آشنا کے پاس
کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کیجیے



جامِ ہر ذرہ، ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھ سے
جوشِ فریاد سے لوٹکا دیتِ خوابِ اسدا
شوخیِ غمزہٗ بیدل نے جگایا ہے مجھ سے



دلِ گاہ، تسکیں خیزِ بیدردی نہ ہو یارب!
نفسِ آئینہ دار آہ بے تملیضِ بہتر ہے
خدایا، چشمِ اہلِ درد ہے افسوسِ آگاہی
بگر حیرتِ سوادِ خوابِ بے تعمیرِ بہتر ہے
دردِ جوہرِ آئینہ، چونِ گِ جنابوں ہے
تباں! نقشِ خود آرائی، حیاتِ تحریرِ بہتر ہے

در یوزہ سامانہا، اے بے سراسمانی !
 تماشِ تماشا ہا، اقبالِ تماشا ہا
 دعوائے جنوں باطل تسلیمِ عبث حاصل
 نیگا نگی خواہ، موجِ زرم آہو ہا
 پروازِ پشِ رنگے، گلزارِ مہِ تنگے
 سنگ آمدِ سخت آمد، دردِ سرِ خود داری
 ایجاو گریبا نہا، در پردہ عریانی
 عجزِ عرقِ شرمے، اے آئینہ اجرائی
 پروازِ فناِ مشکل، میں عجزِ تن آسانی
 دامِ محطہ اُلفت، رنجِ پشیمانی
 خوں ہو نفسِ دل میں اے فوقِ پرائشانی !
 معذورِ سبکساری، مجبورِ گراختانی
 گلزارِ تماشا ہوں، گلچینِ تماشا ہوں
 صد نالہ اسدلِ بیل، در بندِ زبان دانی

دو جہاں گردِ شمسِ مجھ اسرارِ نیاز
 خلوتِ دل میں کر دُخل بجزِ سجدہ شوق
 نقدِ صد دل، بگریبانِ سحرِ نہاں ہے
 آسماں میں صفتِ آئینہ در پہناں ہے

نظرِ پرستی و بیکاری و خود آرائی
 خرابِ نالہِ بیل، شہیدِ خندہ گل
 ہزارِ فافلہ آرزو، بیاباںِ مرگ
 وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ، عجزِ دفا
 رقیبِ آئینہ ہے حیرتِ تماشا ئی
 ہنوزِ دعوئے تمکین و نیمِ رسوائی
 ہنوزِ محلِ حسرت بہ دوشِ خود رائی
 اسدل ! ہنوزِ گمانِ سرورِ دانائی



گداے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے کہ خاموشی کو ہے ہر ایہ بیاں تجھ سے
فسردگی میں ہے فریادِ بیداروں تجھ سے چراغِ صبحِ گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
بہارِ حیرتِ انظارِ بہشتِ جانی سے خدائے پایے اہلِ خونِ کشنگانِ تجھ سے
طراوتِ سحرِ احبابِ اثرِ عیسو بہارِ نالہ و زنجبلیِ نعتِ ناں تجھ سے
چمنِ چمنِ گلِ آیینہ درکنارِ ہوس اُمیدِ محوِ تماشاے گلستاں تجھ سے
نیاز، پردہ اظہارِ خود پرستی ہے جبینِ بجدہ نشاں تجھ سے آسماں تجھ سے
بہانہ جوئی رحمت، اکیس گرِ تقریبِ وفاے حوصلہ ورنجِ امتحاں تجھ سے
اسد! بہ موسمِ گلِ درِ طلسمِ کنجِ قفس
خرامِ تجھ سے، اصبا تجھ سے گلستاں تجھ سے



چار سوسے عشق میں صاحبِ دکانی مُفت ہے
نقد ہے داغِ دل اور آتشِ زبانی مُفت ہے
چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کو تار ہے
بر ہوسہاے جہاں دامنِ نشانی مُفت ہے



اسد! جاں نذرِ الطاف، کہ ہنگام ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو، حالِ دل پر سیدی جانے



رکھ منکر سخن میں تو معذور مجھے غالب!
یاں زورِ قی خود داری طومانی معنی ہے



رنجشیں یارِ مہرباں عیش و طرب کا ہے نشاں
دل سے اُٹھے ہے جو غبار، گردِ سوادِ باغ ہے
شعر کی فکر کو اسد! چاہیے ہے دل و دماغ
عذر، کہ یہ فسر وہ دل بے دل و بے دماغ ہے

